المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

○

نگران

شیخ محبوب عالم خالد۔ ایم۔ اے

○

مدیر اعلیٰ

مبارک احمد عابد

مدیر

ہدایت اللہ ہادی

○

جلد ۱۵ ○ جولائی اگست ستمبر ۱۹۶۵ء ○ شمارہ ۱

(جنید ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے شائع کیا۔)

عکس

تبرکات

ادارتیہ — ادارۂ تحریر

کلام الامام — سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام

امام الکلام — سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ

مقالات و مضامین

جنید ہاشمی، داؤد طاہر، عبدالسبحان۔

گلہائے رنگا رنگ

خلیل الرحمن شاہد، حسن محمد خان عارف، محشر
عبدالشکور، نسیم احمد سیفی، مقبول احمد ہاشمی

شبستان غزل

شریک محفل:-

پرویز پروازی، چوہدری محمد شریف خالد
شیخ روشن دین تنویر، حکیم سید عبدالہادی
مبارک احمد عابد، ہدایت اللہ ہادی
م۔ الف۔ فائق۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ؕ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۙ مَّاکِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا ۙ وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ۙ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِھِمْ کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا ۔ فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ۔

(سورہ کہف)

ترجمہ:۔ ہر تعریف کا اللہ تعالیٰ ہی مستحق ہے جس نے یہ کتاب اپنے بندہ پر اتاری ہے اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی، اور اس نے اسے سچ سے معمور اور صحیح رہنمائی کرنے والی بنا کر اتارا ہے۔ تاکہ وہ لوگوں کو اسکی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ایک سخت عذاب سے آگاہ کرے اور ایمان لانے والوں کو جو نیک اور ایمان کے مناسب حال کام کرتے ہیں بشارت دے کہ ان کے لئے خدا تعالےٰ کی طرف سے اچھا اجر مقدر ہے۔ وہ اس اجر کے مقام میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور نیز اس نے اس لئے اسے اتارا ہے کہ تا وہ ان لوگوں کو آنے والے عذاب سے آگاہ کرے جو یہ کہتے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ نے فلاں شخص کو بیٹا بنا لیا ہے انہیں اس بارہ میں کچھ بھی تو علم حاصل نہیں اور نہ ان کے بڑوں کو اس بارہ میں کوئی علم تھا یہ بہت بڑی خطرناک بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے بلکہ وہ محض جھوٹ بول رہے ہیں۔ کیا اگر وہ اس عظیم الشان کلام پر ایمان نہ لائیں تو تُو ان کے غم میں شدت افسوس کی وجہ سے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال دے گا۔

قَالَ الرَّسُولُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ۔ يَقُوْلُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيْمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ اِلَّا اَنْ يُّؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ فَاِنْ اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ ،

(بخاری)

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر مسلمان پر اپنے افسروں کی ہر بات سننا اور ماننا فرض ہے خواہ اسے ان کا حکم اچھا لگے یا بُرا لگے۔ سوائے اس کے کہ وہ کسی ایسی بات کا حکم دیں جس میں خدا اور رسول کے کسی حکم کی (یا کسی بالا افسر کے حکم کی) نافرمانی لازم آتی ہو ——— اگر وہ ایسی نافرمانی کا حکم دیں تو پھر اس میں ان کی اطاعت فرض نہیں۔

پیارا نبیؐ اور پیاری کتاب

(کلمات طیبات سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام)

" اللہ تعالیٰ جو انبیاء کو بھیجتا ہے اور آخر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اس نے دنیا کی ہدایت کے واسطے بھیجا اور قرآن مجید کو نازل فرمایا تو اسکی غرض کیا تھی ؟ ہر شخص جو کام کرتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے۔ ایسا خیال کرنا کہ قرآن شریف نازل کرنے یا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی غرض اور مقصد نہیں ہے۔ کمال درجہ کی گستاخی اور بے ادبی ہے۔ کیونکہ اس میں (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کی طرف ایک فعل عبث کو منسوب کیا جائے گا۔ حالانکہ اس کی ذات پاک ہے (سبحانہ وتعالیٰ شانہٗ) پس یاد رکھو کہ کتاب مجید کے بھیجنے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ تا دنیا پر عظیم الشان رحمت کا نمونہ دکھاوے۔ جیسے فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْن اور ایسا ہی قرآن مجید کے بھیجنے کی غرض بتائی کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْن یہ ایسی عظیم الشان اغراض ہیں کہ ان کی نظیر نہیں پائی جا سکتی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ جیسے تمام کمالات متفرقہ جو انبیاء میں تھے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وجود میں جمع کر دیئے۔ اسیطرح تمام خوبیاں اور کمالات جو متفرق کتابوں میں تھے وہ قرآن شریف میں جمع کر دیئے اور ایسا ہی جس قدر کمالات تمام امتوں میں تھے وہ اس امت میں جمع کر دیئے۔ پس خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم ان کمالات کو پالیں اور یہ بات کبھی بھولنی نہیں چاہیئے کہ جیسے وہ عظیم الشان کمالات ہم کو دینا چاہتا ہے اسی کے موافق اس نے ہمیں قویٰ بھی عطا کئے ہیں۔ کیونکہ اگر اس کے موافق نہ دیئے جاتے تو پھر ہم ان کمالات کو کسی صورت اور حالت میں پا ہی نہیں سکتے تھے "

(ملفوظات جلد اوّل صفحہ ۳۴۰-۳۴۱)

اداریہ

ادارۂ المنار سب سے پہلے اس کالج میں نئے داخل ہونے والے طلبہ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے اور دعاگو ہے کہ ان کا آنا ان کے لئے اور کالج کے لئے باعث فخر و صد افتخار بنے۔ میرے دوستو! آپ اپنی تعلیم کا ایک مرحلہ فتح و کامرانی سے طے کر کے ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوئے ہیں۔ آپ کے دلوں میں نئی امنگیں، نئے ولولے، نئے عزم اور نئے مقاصد مچل رہے ہوں گے۔ اپنی تعلیم کی منزل پہلے سے قریب تر پاکر یہ نہ بھول جائیں کہ آپ کس غرض اور مدعا کو لے کر کالج میں داخل ہوئے ہیں۔ یہاں سکول سے نسبتاً آزاد ماحول میسّر دیکھ کر آپ دل میں یہ آشائیں نہ پیدا کرلیں کہ اب ہم کالج کے طلبہ ہیں۔ جو چاہیں کریں ——— ساتھیو! آپ کا پہلا مرحلہ بھی متحرکانہ جد وجہد اور مسلسل محنت کی وجہ سے بخیر و خوبی طے ہوا ہے اور آئندہ بھی اگر آپ چاہتے ہیں کہ کامیابیوں اور نصرتوں سے ہمکنار ہوں تو اس کے لئے آپ کو سعی مسلسل اور کوشش دوام کا سہارا لینا پڑے گا ———

ساتھیو! جن اقوام یا افراد پر دنیا نازاں ہوتی ہے۔ وہ بھی آپ ہی کی طرح کے انسان ہیں۔ وہ کبھی آپ جیسے طالب علم تھے۔ ان کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ زمانہ طالب علمی بلکہ اپنی ابتدائی زندگی میں ہی اس گُر پر کاربند تھے۔ کہ انھوں نے عمل اور کردار کو اس سانچے میں ڈھالنا ہے جس کا دھندلا سا تصوّر وہ اپنے مقاصد کے جہان میں رکھتے ہیں۔ گویا شروع ہی سے وہ اعلےٰ اور ارفع مقاصد حاصل کرنے کے لئے چند اصول وضع کر لیتے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنے خواب حقیقت کے روپ میں دیکھ لیتے ہیں۔ دور نہ جائیے اپنے اسلاف کی ہی مثال لیجئے ان کی زندگی کے اصولوں کا مطالعہ کیجئے۔ ان کے اعمال و افکار کی ایک جھلک بھی دیکھئے تو آپ پر یہ حقیقت مکمل جائے گی کہ وہ یقین محکم، عمل پیہم اور باہمی الفت کے ایسے مسلک سے منسلک تھے کہ جس کی نظیر آج کے ترقی یافتہ معاشرہ میں بھی خال خال نظر آتی ہے۔

میرے دوستو! کبھی یہ خیال آپ کے دل میں جاگزیں نہ ہو کہ آپ کی ایسی تقدیر کہاں کہ آپ مشاہیر زمانہ بن سکیں

آپ احساسِ کمتری میں کس لئے مبتلا ہیں؟ آپ غلط زاویۂ نظر سے کیوں سوچتے ہیں. آپ کونسے اصولوں کی وجہ سے اندھیرے پہلو پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں؟ آخر آپ خود کو اتنا بے بس کیوں سمجھتے ہیں ——— ایسے مایوس خیالوں سے فوراً چھٹکارا پائیں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ آج سے ہی اگر بلند مقاصد کو لے کر اپنے عمل کی شاہراہ پر آمن طور سے چلنے لگیں ——— تو آپ کل کے قائدِ اعظم ہوں گے. ——— آپ میں سے کئی علامہ اقبال نکلیں گے ——— آپ میں سے ہر ایک نیوٹن اور نپولین جیسی شہرت حاصل کرے گا بشرطیکہ آپ دیانتداری، مستعدی، اور نیک دلی سے علم حاصل کریں اور پھر اس علم پر عمل کا سہاگہ لگا کر اپنے نام کو تابناک اور درخشندہ بنالیں۔ ساتھیو! جس طرح ایک چراغ تیل کے بغیر ضیا نہیں دیتا۔ اسی طرح علم بھی عمل کے بغیر بے فائدہ اور ناکارہ ہے ———

ساتھیو! آج سے یہ عزم لے کر عمل کے سمندر میں کود جاؤ کہ ہم نے حادثات اور ناکامیوں کے رُخ اپنے زورِ عمل سے پھیر دیئے ہیں ——— ہم نے مایوسیوں اور اندھیروں کے سائے کو اپنے نورِ کردار سے نیست و نابود کر دیا ہے ——— ہم نے وقت کی قدر کر کے اپنی حیات کو درخشاں کر دیا ہے۔

بے عمل میں کامیابی موت میں ہے زندگی
جا لپٹ جا لہر سے دریا کی تو پرواہ نہ کر

آخر میں ادارۂ المنار آپ سے گزارش کرتا ہے کہ آپ اپنے "المنار" کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کے لئے اپنی قلمی معاونت سے ہمیں نوازتے رہیں اور اپنی تحریر کی جولانیوں سے اپنے پیارے رسالہ کی رعنائیوں اور خوبصورتیوں کو چار چاند لگاتے رہیں

(مبارک احمد عابد)

ارسطو نے کہا تھا کہ زندگی میں دُکھ اور درد بھر جائیں تو زندگی بہت لمبی معلوم ہوتی ہے شائد اس نے وہ دکھ مراد لئے ہوں جو وقت کی رفتار کو روکتے ہوئے محسوس ہوتے ہوں۔ لیکن ایسے واقعات بہت کم ہوتے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ زندگی بہت مختصر معلوم ہوتی ہے۔ اتنی مختصر جیسے اور

کم نہ کیا جاسکے۔ وقت کے اِس بحرِ بیکراں میں زندگی کی چھوٹی سی کشتی کی حقیقت ہی کیا ہے۔ چند لمحے ڈولتی رہی اور پھر کسی پاگل موج سے ٹکرا کر وقت کی طرح ہی بیکراں ہوگئی۔ میں کوئی قنوطی تو نہیں جو آپ کو ایسی باتیں بتا کر آپ کے ہونٹوں سے مُسکراہٹ چھین لینا چاہتا ہوں۔ بلکہ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ہمیں TENNYSON کے ULYSSES کی طرح زندگی کے جام کو تلچھٹ تک پی لینا چاہیئے۔ اور زندگی کے لمحات سے پورا پورا انصاف کرنا چاہیئے۔ یہ ضمنی بات خاص طور پر نئے آنے والوں کے لئے کہنا چاہتا ہوں کیونکہ انہیں زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہو جانے پہ وقت کی تیز رفتاری کا احساس ہو چکا ہوگا

اب جب کہ آپ کے سامنے ایک وسیع افق ہے، ایک نیا ماحول ہے، اور حال اور مستقبل بھی ماضی سے بہت مختلف معلوم ہو رہے ہیں تو لازم ہے کہ آپ اپنی زندگی کو بھی ایک نئے سانچے میں ڈھالئے۔ نئے ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کیجیئے اور ایک تابناک مستقبل کی امید کیجیئے۔ اپنی پُرانی باتوں کو ایسے بھول جائیے جیسے کبھی تھیں ہی نہیں اور آپ اس دنیا میں نو وارد ہیں۔ یہ احساس رکھتے ہوئے ایک نئے عزم سے زندگی شروع کیجیئے اور یہ مت بھولئے کہ خدا آپ کے ساتھ ہے ؎

نیا سفر ہے، نئی منزلیں، نئی راہیں
نئے چراغ جلاؤ نئے سفر کے لئے

(ہدایت اللہ بلوچ)

پچھلے دنوں ہمارے کالج کے ایک مستعد، قابل اور لائق اُستاد جناب مولوی محمد الدین صاحب ایم۔اے صدر شعبۂ اسلامیات نہایت ہی احسن طریق سے اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کے بعد اپنی معیادِ ملازمت ختم ہونے پر سبکدوش ہو گئے۔

آپ نے اپنی ملازمت کے دوران طلبہ اور اساتذہ سے جو سلوک کیا۔ وہ قابلِ صد ستائش ہے۔ آپ نے نہایت دل جمعی، خلوص اور استقلال سے اپنے کام کو نبھایا۔ طلبہ اور اساتذہ آپ کی پُرخلوص اور ناقابلِ فراموش خدمات کے مدّاح ہیں۔ آپ نے استاد اور شاگرد کے مقدّس رشتہ کو پدرانہ شفقت کے احساسات سے کماحقہٗ اجاگر کر کے طلبہ کے دلوں پر محبت اور خلوص کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

کالج کے تمام طلبہ دعاگو ہیں کہ اللہ تعالےٰ آپ کو بیش از بیش خدمات کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

(ادارہ)

کلام الامام

(سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام)

اک نہ اک دن پیش ہوگا تُو فنا کے سامنے
چل نہیں سکتی کسی کی کچھ قضا کے سامنے

چھوڑنی ہوگی تجھے دُنیائے فانی ایک دن
ہر کوئی مجبور ہے حُکمِ خدا کے سامنے

مستقل رہنا ہے لازم اے بشر تجھ کو سدا
رنج و غم یاس و الم فکر و بلا کے سامنے

بارگاہِ ایزدی سے تو نہ یوں مایوس ہو
مشکلیں کیا چیز ہیں مشکل کشا کے سامنے

حاجتیں پوری کریں گے کیا تری عاجز بشر
کر بیاں سب حاجتیں حاجت روا کے سامنے

چاہیئے تجھ کو مٹانا قلب سے نقشِ دوئی
سر جھکا بس مالکِ ارض و سما کے سامنے

چاہیئے نفرت بدی سے اور نیکی سے پیار
ایک دِن جانا ہے تجھ کو بھی خدا کے سامنے

راستی کے سامنے کب جھوٹ پھلتا ہے بھلا
قدر کیا پتّھر کی لعلِ بے بہا کے سامنے

اِمامُ الکلام

(سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ)

ذکرِ خدا پہ زور دے ظُلمتِ دل مٹائے جا
گوہرِ شب چراغ بن دُنیا میں جگمگائے جا

دوستوں دشمنوں میں فرق؛ دأبِ سلوک یہ نہیں
آپ بھی جامِ مے اڑا غیر کو بھی پلائے جا

خالی امید ہے فضول، سعیٔ عمل بھی چاہیئے
ہاتھ بھی تو ہلائے جا آس بھی تُو بڑھائے جا

جو لگے تیرے ہاتھ سے زخم نہیں علاج ہے
میرا نہ کچھ خیال کر زخم یونہی لگائے جا

مانیں نہ مانیں اس سے کیا بات تو ہوگی دو گھڑی
قصۂ دل طویل کر بات کو تُو بڑھائے جا

کشورِ دل کو چھوڑ کر جائیں گے وہ بھلا کہاں
آئیں گے وہ یہاں ضرور بس تُو انہیں بلائے جا

منزلِ عشق ہے کٹھن راہ میں راہزن بھی ہیں
پیچھے نہ مڑ کے دیکھ تو آگے قدم بڑھائے جا

عشق کی سوزشیں بڑھا جنگ کے شعلوں کو دبا
پانی بھی سب طرف چھڑک آگ بھی تو لگائے جا

مقالات

مضامین

○ جنید ہاشمی

○ داؤد طاہر

○ عبدالسبحان

مجید ہاشمی

مثنوی گوئی پر اجمالی نظر!

مثنوی کا لفظ لغوی لحاظ سے اگرچہ عربی ہے لیکن جن اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اس کا وجود قدیم عربی شاعری میں نہیں ملتا مثنوی کا موجودہ مفہوم فارسی اور اردو شاعری میں ایک ایسی مسلسل نظم کا ہے جو شروع سے آخر تک ایک بحر میں کہی گئی ہو لیکن اس کے قافیہ یا ردیف کی پابندی صرف ایک بیت کے دو مصرعوں میں ہوتی ہے، غزل یا قصیدہ کی طرح پوری نظم میں قافیہ یا ردیف نبھانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے اشعار کی تعداد بھی متعین نہیں ہے اور نہ ہی مضمون کی قید ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی آزادی شاعری کی دیگر اصناف میں کم ملتی ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی زبان میں جب ادب کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے تو سب سے پہلے یہی ظہور میں آتی ہے۔ چنانچہ انگریزی اور فرانسیسی ادب کی تاریخ مغرب میں۔ اور فارسی و اردو ادب کی مشرق میں اسکی تائید کرتی ہے۔ مثنوی کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر ادب کا شاہکار بالعموم اسی انداز میں پایا جاتا ہے۔ ہومر کی تصانیف، فردوسی کا شاہنامہ، کالیداس کی شکنتلا سب اسی قسم کی مسلسل نظمیں ہیں۔

فارسی شعر و ادب نے عربی سے بہت کچھ مستعار لیا ہے چنانچہ فارسی شاعری کے اوزان اور اس کے ارکان ابھی تک عربی ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں لیکن مثنوی کی صنف ایسی ہے جس میں شعرائے عجم عربوں کے احسان مند نہیں ہیں۔ فارسی میں ہر قسم کی مثنویاں کہی گئی ہیں۔ اس میں عشقیہ اور بزمیہ داستانیں بھی ہیں اور رزمیہ تاریخی اور نیم تاریخی نظمیں بھی ہیں۔ بعض مثنویوں کا موضوع محض پند و نصائح ہے اور بعض میں اخلاق و تصوف کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ اس فخر کا اندازہ جو عجمیوں کو اپنی مثنویوں پر تھا اس شعر سے ہوتا ہے جو مولانا روم کی مثنوی کی مدح میں کہا گیا ہے ؎

مثنوئ مولوئ معنوی ! ؛ ہست قرآں در زبانِ پہلوی

فارسی میں مثنوی کا ڈھانچہ کچھ مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ مثنوی کے شروع میں سب سے پہلے حمد ہوتی تھی۔ حمد کے مضامین بھی مثنوی کی مناسبت سے ہوتے تھے یا تو شاعر اللہ تعالیٰ کو 'خلاقِ سخن' قرار دے کر اسکی تعریف کرتا تھا یا پھر اسے شاہدِ حقیقی قرار دے کر اس کی حمد میں عشقیہ مضامین لکھتا تھا۔ حمد کے بعد نعت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ منقبت حضرت علیؓ اور

دیگر اصحاب کرام کی تعریف بھی شامل کی جاتی تھی۔ اس مرحلہ کے بعد عام طور پر شاعروں نے کسی سلطان یا امیر کی مدح کی ہے اور یہ تمہیدی حصّہ بالعموم تعریف سخن پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ایسا ڈھانچہ ہے جو اردو میں بھی بیشتر مثنویوں میں نظر آتا ہے۔ جہاں اس سے انحراف کیا گیا اسکی ایک قدیم مثال افضل جھنجھانوی کے "بارہ ماسہ" میں ملتی ہے۔ جس میں افضل نے اپنی زندگی کی داستان بیان کی ہے۔ یہ قصّہ عاشقانہ مثنویوں کی رسمی نظر سے ہٹا ہوا ہے۔ اس کی ساخت بھی مختلف ہے۔ افضل نے اس مثنوی میں ہندی کے بارہ ماسوں کا طرز اختیار کیا ہے اسی لئے اس کو بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی کہتے ہیں۔ بارہ ماسہ میں قصّہ کو سال کے بارہ مہینوں کے اعتبار سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور شاعر مہینوں کے موسم کے اعتبار سے اپنے جذبات اور اس کے سلسلے میں قصّہ کا آگے بڑھانا بیان کرتا ہے۔ ادھر مثنویوں میں بھی منظر نگاری کا موقع بہت آتا ہے لیکن جو وسعت و بسط بارہ ماسہ میں ہے وہ مثنوی کو میسّر نہیں آئی۔

فارسی کے علاوہ سنسکرت نے بھی اردو کے ابتدائی منظوم قصوں پر اثر ڈالا ہے۔ قدیم دور کے اکثر شعراء نے "طوطی نامہ" کے نام سے ایک کہانی لکھی ہے۔ جس کا اصل ماخذ سنسکرت ہے اس میں بادن کہانیاں تھیں اور یہ قصّہ در قصّہ کے انداز کی نظم ہے سنسکرت سے اس کا ترجمہ فارسی میں ہوا خصوصاً فارسی کے دو ترجمے اکبر کے عہد کے بہت مشہور ہیں۔ اردو کے قدیم کے شعراء نے ان فارسی ترجموں میں سے ایک کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ دکن کے مصنّفین نے اسے نظم اور نثر دونوں میں لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں ان دکنی طوطی ناموں کی شہرت شمالی ہند تک پہنچ چکی تھی۔ اور بعد کی مثنویاں کم و بیش انہی طوطی ناموں سے ماخوذ ہیں۔

اردو مثنویوں کا پہلا دور دکنی مثنویوں کا ہے۔ جدید ترین تحقیق کے مطابق بہمنی عہد کے آخر میں نظامی نام کے کسی شاعر نے ایک مثنوی "رتن پدم قدم راؤ" کے نام سے لکھی تھی۔ جس کے چند ایک اقتباسات نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب میں دیئے ہیں۔ لیکن یہ اتنے مختصر ہیں کہ بمشکل اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مثنوی کی زبان کیسی ہے۔ بظاہر یہ زبان نامانوس اور گنجلک ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس دور کی پہلی مثنوی "قطب مشتری" ہے جسے وجہی نے نظم کیا ہے۔ قدیم دکنی شعراء میں وجہی کا نام سرفہرست ہے۔ قطب مشتری کے علاوہ اس کی دوسری سب سے مشہور تصنیف "سب رس" ہے۔ اس طرح وجہی کو ہم اردو کا پہلا مکمل شاعر اور ادیب تصور کرتے ہیں۔ وجہی سلطان محمد قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اگرچہ اسکی شاعری کا آغاز قلی قطب شاہ کے والد ابراہیم قلی قطب شاہ کے عہد سے ہو چکا تھا۔ قطب مشتری کا سن تصنیف ۱۰۱۸ھ ہجری ہے۔ مثنوی کا آغاز حسب دستور حمد و نعت اور منقبت سے ہوا ہے۔ اس کے بعد ابراہیم قطب شاہ کی تعریف ہے۔ اس منزل سے گزر کر وجہی نے "تعریف سخن" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت اہم ہے

اور کسی اُردو شاعر یا ادیب نے اردو شاعری یا ادب کی تنقید کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں ان کا پہلا نمونہ ملتا ہے۔ اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعری کے لیے پہلی صفت یہ ہے کہ کلام منتخب ہو یعنی بجائے پچیس بیت لکھنے کے یہ بہتر ہے کہ شاعر صرف ایک اچھا بیت لکھے وغیرہ،

بے ربط بولے توں بتیاں پچیس[۲۵]
بہتر کہ یک بیت بولے سلیس (وجہی)

خود قلی قطب شاہ کو مسلسل نظمیں کہنے سے خاص دلچسپی تھی۔ اسی لیے اس کی کلیات میں چھوٹی بڑی کئی مثنویاں ہیں ان میں سے بعض عشقیہ ہیں اور بعض میں مناظر فطرت یا مختلف رسموں اور تیوہاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی یہ مثنویاں ایک ابتدائی رنگ کو پیش کرتی ہیں کیونکہ فارسی میں مثنوی گوئی کا جو انداز تھا۔ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں قصہ پن بہت کم ہے لیکن اسکی تلافی مناظر اور جذبات نگاری نے کر دی ہے۔ اور اس طرح اردو مثنوی کی تاریخ میں اسے نئی راہیں کھولنے کا شرف حاصل ہے۔ دکنی مثنویوں کا یہ دور در اصل تراجم کا دور ہے۔ زیادہ تر فارسی کی مثنویوں کے ترجمے ہوئے ان میں رزمیہ اور بزمیہ دونوں قسم کی مثنویاں شامل ہیں۔ بعض قابل ذکر مثنویوں کے نام یہ ہیں :-

۱۔ گلشنِ عشق ۔ مصنفہ ملک الشعراء نصرتی ۔ ۲۔ خاور نامہ ۔ مصنفہ کمال خان
۳۔ پھول بن ۔ مصنفہ ابن نشاطی ۴۔ قصہ رضوان شاہ و روح افزا ۔ مصنفہ فائز
۵۔ من لگن ۔ مصنفہ محمود بحری وغیرہ وغیرہ ۔

دکھنی مثنویوں کا یہ دور نہایت ہی اہم ہے۔ سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد پانچ چھوٹی چھوٹی حکومتیں علیحدہ قائم ہوئی تھیں جن میں اردو کی سرپرستی کے لئے گولکنڈہ اور بیجاپور کے نام مشہور ہیں ان دونوں مرکزوں میں شاعری کی روایات اور اسالیب میں کسی قدر فرق پایا جاتا ہے۔ مثنویوں کے سلسلہ میں یہ بات نمایاں ہے کہ گولکنڈہ میں زیادہ تر بزمیہ اور طربیہ مثنویاں لکھی گئی گئیں۔ اور بیجاپور میں زیادہ تر رزمیہ کارنامے نظم ہوئے۔ اس سے دونوں ریاستوں کے ملکی ماحول اور شاعرانہ مذاق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ولی تک کسی قابل قدر شاعر یا اس کے دیوان کا پتہ نہیں چلتا۔ افضل کے بارہ ماسہ کو چھوڑ کر میر و سودا کے عہد سے پہلے شمالی ہند میں کوئی مثنوی نہیں ملتی۔ اگرچہ حالی کا یہ قول صحیح نہیں کہ "میر تقی میر نے سب سے پہلے اردو میں چند عشقیہ مثنویاں لکھیں" لیکن اس میں شبہ نہیں کہ میر سے پہلے شمالی ہند میں کسی مثنوی کا اب تک پتہ نہیں چلا۔ اسیطرح مظہر جانِ جاناں اور خان آرزو کی غزل گوئی کا حوالہ اکثر تذکروں میں ملتا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے مثنوی نہیں کہی۔ ان

کے معاصرین مضمون، آبرو، شاکر، ناجی، سب ایہام گوئی میں مبتلا تھے۔ کسی کو غزل کے دائرے سے نکلنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

میر تقی میر نے اپنی غزلوں پر بڑا ناز کیا ہے لیکن ان کی مثنویاں بھی بڑی اہم ہیں۔ سودا اگرچہ ان کے حریف تھے لیکن انھوں نے بھی میر کی مثنویوں کو پسند کیا ہے۔ چنانچہ میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کو انہوں نے نثر میں لکھا۔ مصحفی جو بار بار میر و میرزا کی ہمسری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ انہوں نے "دریائے عشق" کو سامنے رکھکر "بحر المحبت" نظم کی اور اس میں یہ اعتراف کیا کہ میر نقاشِ اوّل تھے۔ میں انہی کے نقش میں نیا رنگ بھرتا ہوں۔

میر کی مثنویاں موضوع کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم ایسی مثنوی کی بھی ہے جس سے ان کی زندگی کے ذاتی حالات اور واقعات پر روشنی پڑتی ہے مثلاً دو مثنویاں خود اپنے گھر پر لکھی ہیں۔ ایک میں گھر ان کی تنگی و تاریکی اور اسکی خستگی و کہنگی کا نقشہ کھینچا ہے اور دوسری میں اسی مکان میں برسات گزارنے کا حال لکھا ہے۔ ایک مثنوی میں اپنی "پالتو بلی" کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ مثنوی بھی قابل توجہ ہے جس میں انہوں نے اپنے حریفوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کا نام "اژدرنامہ" رکھا ہے۔

ایک مثنوی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ باوجود غربت وافلاس کے ان کے معاصرین کے بقول ان کا دماغ عرش معلّٰی پر ہی رہتا تھا۔۔۔ لکھنؤ پہنچ کر وہاں کی تہذیب اور معاشرت کے متعلق بھی مثنویاں لکھی ہیں۔ ایک مثنوی "مرغ بازی" پر لکھی ہے۔ اس زمانہ میں لکھنؤی معاشرت میں "مرغ بازی" کے شوق میں بادشاہ سے لے کر عوام تک مبتلا تھے بلکہ میر تقی میر کی پہلی ملاقات آصف الدولہ سے مرغوں کی ایک پالی میں ہوئی تھی۔ بہرحال ان کی لکھنؤی زندگی کے دوران کی عاشقانہ مثنویوں میں شعلۂ عشق اور دریائے عشق مشہور ہیں۔ وہاں آصف الدولہ کی شادی شکار نامے۔ سیر و تفریح وغیرہ مضامین پر بھی مثنویاں موجود ہیں۔

میر کے بعد مثنوی کی تاریخ میں دوسرا قابل ذکر نام سودا کا ہے۔ سودا کی مثنوی گوئی کے متعلق شیفتہ کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے کہ

"مرزا در مثنوی سلیقۂ معقول نداشت"

یہ صحیح ہے کہ سودا کی طبیعت کا خاص رجحان قصیدہ کی طرف تھا۔ گویا جس طرح میر پر غزل کا رنگ چھایا ہوا تھا سودا کی طبیعت پر قصیدہ غالب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کثرت سے ایسی مثنویاں لکھی ہیں جن میں اپنے خارجی ماحول کی ترجمانی کی ہے۔ دو چیزیں ان میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ایک زور کلام اور دوسرے طنز۔ مثنویوں کو سب سے

پہلے اخلاقی مقصد کے لئے انھوں نے ہی استعمال کیا ہے۔ دو مثنویاں موسم گرما اور موسم سرما پہ لکھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلّی میں ایک سال سخت سردی اور سخت گرمی پڑی جس کی شدت کا اظہار میرؔ اور سوداؔ دونوں نے کیا ہے۔ مصحفی نے بھی میرؔ کی طرح ایک مثنوی اپنے گھر کی خرابی پہ لکھی ہے۔ شاید یہ موضوع اس زمانے کے شعراء کو خاص طور پہ مرغوب تھا! ایک علیحدہ مثنوی اپنی چارپائی کی تعریف میں لکھی ہے اور اسے "شیطان کی قبر" سے تشبیہ دی ہے۔ مصحفی کی زندگی بھی بڑی مصیبت اور تکلیف میں گزر رہی تھی۔ اور اسے زندگی کی معمولی آسائشیں بھی میسّر نہ تھیں۔ چنانچہ ایک مثنوی "خراسانی اجوائن" کی تعریف میں لکھی ہے اور اپنی بیماریوں کا ذکر کیا ہے۔ اسیطرح ایک مثنوی "بسرِ حجام" کی تعریف میں لکھی ہے۔ مثنویوں کے ان نمونوں کو اگر سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی کا درجہ میرؔ و سوداؔ سے اگر بلند نہیں تو ان کے برابر ضرور ہے۔

اس کے بعد میر حسن کی شہرۂ آفاق مثنوی "سحرالبیان" لکھی گئی ہے۔ اگرچہ مثنوی لکھنؤ میں لکھی گئی اور جس زندگی اور تہذیب و معاشرت کی ترجمانی کی گئی ہے وہ لکھنوی ہے لیکن شاعری کے انداز میں یہ مثنوی، دہلوی رنگ کو ہی ظاہر کرتی ہے۔ میر حسن نے سارا زور اثر آفرینی پہ صرف کیا ہے حالانکہ اس عہد کے لکھنؤ میں اخلاقی معیار گر نا شروع ہو گیا تھا۔ تاہم میر حسن نے متانت اور سنجیدگی کا دامن نہیں چھوڑا۔ میر حسن نے یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ میں لکھی۔ اور قریباً نصف صدی بعد ۱۲۵۴ھ میں دیا شنکر نسیم نے "گلزارِ نسیم" مثنوی لکھی۔ تنقید نگاروں نے صفحے کے صفحے ہر دو مثنویوں کے مقابلے کے رنگ میں لکھ ڈالے۔ حالانکہ میر حسن اور نسیم کا موازنہ کرتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ دونوں مثنویوں کی تاریخ تصنیف میں نصف صدی کا فرق ہے۔ اس عرصہ میں شاعری کا عام مذاق بدل چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ میر حسن کا قصہ طبعزاد ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی گھڑنے بڑھانے کا انہی پہ دارومدار تھا۔ نسیم کا قصہ فارسی اور اردو زبانوں میں پہلے موجود تھا۔ اس لئے ان کے کمال کا اظہار صرف زبان و بیان میں ممکن تھا۔ گلزارِ نسیم کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لکھنو رنگ کی ایک مسلسل غزل ہے۔ کیونکہ جزئیات نگاری یا مناظرِ فطرت اور جذباتِ انسانی کی تفصیلی ترجمانی جو مثنویوں کی خاص چیزیں ہیں اس میں نہیں پائی جاتیں اس کے برعکس زبان اور بیان کی خوبی جس پہ لکھنوی غزل گوؤں نے اپنی ساری توجہ صرف کی تھی اس میں موجود ہے۔

مثنوی میں جہاں معاملہ بندی کا موقعہ آتا ہے وہاں متانت و سنجیدگی کا تقاضا یہ ہے کہ اختصار ملحوظ رکھا جائے اور اشارہ و کنایہ سے کام لیا جائے۔ میر حسن نے اختلاط کے موقعے بھی تفصیل سے لکھے ہیں اور شاید انہی کو سامنے رکھتے ہوئے انشاء اللہ خان نے تنقید کی تھی، ہر چند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی ہے گویا سانڈے

ہوتیں پیچھے ہیں ۔ تاہم سحر البیان کے مقابلہ میں "گلزار نسیم" باعتبار محاکات یقیناً ادنیٰ درجہ کی حیثیت رکھتی ہے تشبیہات کی تلاش میں بھی نسیم کا رنگ میر حسن سے مختلف ہے۔ میر حسن کے ہاں بے ساختگی، برجستگی اور ندرت و لطافت کا رنگ غالب ہے ۔

میر حسن کی سحر البیان کے بعد عشقیہ مثنویوں میں سب سے زیادہ شہرت مرزا شوق کی " زہر عشق " کو حاصل ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ بھی ہو کہ حکومت نے اسکی اشاعت پر پابندی لگا دی تھی۔ ایک عرصہ تک مثنوی زہر عشق اور شوق کے دوسرے کلام پر یہی اعتراض رہا کہ ناقدین کے خیال میں اخلاقی نقطہ نظر سے یہ قابل اشاعت نہیں۔ اس کے سب سے بڑے محرک ادبی تنقید میں مولانا حالی تھے۔ جو اگرچہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے سرگرم عنصر تھے لیکن خالص شاعرانہ حیثیت سے ان کا کیا مرتبہ ہو گیا تھا۔ اس پر اختلاف ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں مسدس حالی میں اور مسدس کے بعد کی غزلوں میں جو اصلی حالی ہے وہ مر چکا ہے۔ بہرحال مرزا شوق کی مثنویاں لکھنوی شاعری کے خاص انداز کی بجائے لکھنوی تہذیب و معاشرت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ شوق نے عوام سے تعلق رکھنے والے افراد کو موضوع قصہ بنایا ہے۔ نہ کہ شہزادے شہزادیوں کے قصے بیان کئے ہیں۔ اخلاقی نقطہ نظر سے مرزا شوق کی مثنویوں کو قابل اعتراض اور فحش جو کچھ بھی کہو۔ ان کی فنکاری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے لکھنوی معاشرت کی ترجمانی خلوص اور صحت کے ساتھ کی ہے۔ ان مثنویوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں شعر و شاعری کا مذاق لوگوں میں عام تھا۔ پردے کے رواج کے باوجود مردوں اور عورتوں کا آپس میں ملنا جلنا ممکن تھا۔ لوگوں کو اطمینان اور فارغ البالی حاصل تھی۔ عشق و عاشقی اور ہوس پرستی میں امتیاز باقی نہ رہا تھا۔ عورتوں کو بھی شعر و شاعری کا شوق تھا وغیرہ

سحر البیان اور گلزار نسیم تک قصہ کے جو کردار منتخب کئے جاتے تھے وہ بالعموم بادشاہ، شہزادے شاہزادیاں ہوتے تھے۔ لیکن شوق نے عوام سے تعلق رکھنے والے افراد کو موضوع قصہ بنایا۔ اس لئے جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے مقبول عام ہوئے ۔

مختصر یہ کہ مثنوی کی صنف معاشرت کی عکاسی، جذبات نگاری اور منظر کشی کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے ۔

کلام اگر چاندی ہے تو خاموشی سونا " (مرسلہ غلام مصطفےٰ چیٹھہ سال چہارم)

داؤد طاہر
بی اے

اصلاحِ معاشرہ میں طالب علم کا کردار

گزشتہ سال طلبائے کالج کے لئے اردو مضمون نویسی کے سالانہ مقابلہ کے لئے "اصلاحِ معاشرہ میں طالب علم کا کردار" عنوان مقرر کیا گیا تھا۔ جناب داؤد طاہر (اولڈ سٹوڈنٹ) کا یہ مضمون جو اس وقت ہدیہ قارئین کیا جا رہا ہے۔ ادارہ کی رائے میں مقابلہ کے لئے موصول ہونے والے تمام مضامین میں سے بہترین تھا۔ اور یہی مضمون اوّل العام کا مستحق قرار دیا گیا۔ (ادارہ)

عام طور پر طالب علمی کے زمانہ کو زندگی کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اس وقت طالب علم عملی زندگی کی دشواریوں سے نا آشنا ہر قسم کے تفکرات سے آزاد ہوتا ہے۔ ہر بات سے لاپرواہ ایک ہی دُھن اس پر سوار ہوتی ہے کہ فلاں امتحان پاس کرنا ہے مگر یاد رہے صرف ایسے ادنیٰ مقاصد کے لئے اسے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ اس کے وجود کے ساتھ ہی اس پر بہت سی ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں۔ گو فی الوقت ایک معینہ امتحان میں کامیابی حاصل کرنا ہی اس کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے آپ کو معاشرہ کا ایک اچھا فرد بنانے کی تیاری جاری رکھنی چاہیئے تاجب وہ عملی زندگی میں قدم رکھے تو اپنے آپ کو ایک سلجھا ہوا شہری ثابت کر سکے۔ جس کا کام ہی معاشرے کے اچھے قوانین کی پابندی کرنا کرانا اور اسکی ضرر رساں قیود اور پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کرنا ہو۔

اس مقصد کے لئے سب سے پہلے ہمیں جاننا ہو گا کہ معاشرہ ہے کیا چیز! معاشرہ عربی زبان کا لفظ ہے اور عَاشَرَ یُعَاشِرُ سے باب مُفَاعَلَۃ کے وزن پر مصدر ہے۔ باب مفاعلہ کا خاصہ ہے کہ اس میں فریقین کی شرکت ضروری ہوتی ہے لہذا معاشرہ کے معنے ہوں گے مل جل کر زندگی بسر کرنا ——— اس کے ساتھ ہی اس میں یہ مفہوم بھی آجاتا ہے کہ معاشرہ کے ہر فرد کو دوسرے کے احساسات و جذبات کا خیال رکھنا ہو گا۔ اس کی بھلائی کے لئے کام کرنے ہوں گے اور ایسے امور سے احتراز کرنا ہو گا جس میں دوسرے کا نقصان مضمر ہو۔ نیز غور کرتے رہنا کہ معاشرہ میں کون کون سی برائیاں ایسی پائی جاتی ہیں جن کو دور

کرنے میں اسکی کوششیں بار آور ہو سکتی ہیں ۔

طالب علم پر اگر ایک طرف بحیثیت شہری معاشرہ کی اصلاح کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے تو دوسری طرف بحیثیت طالب علم اسکی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے ـــــــ ایک شہری کے لباس میں وہ صرف وہی ذمہ داریاں ادا کرے گا جو عام شہری ادا کرتے ہیں ۔ مگر ایک طالب علم کے لبادہ میں معاشرہ کی اصلاح کے سلسلہ میں اس کے فرائض ایک عام شہری سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ۔ اس لئے کہ وہ بذات خود قوم کا اہم ترین جزو ہے ـــــــ جسے ملک کی ریڑھ کی ہڈی کا خطاب دیا جاتا ہے ۔ جس کے دل میں علم کے ساتھ ساتھ اگر عمل کی شمع روشن ہو جائے تو اس کا اجالا چاروں بکھر جاتا ہے اور اس اجالے کے دائرے سے معاشرے کا ہر فرد ـــــــ خواہ وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا بوڑھا ہو یا رحل رحل کرتا ہوا بچہ ، ایک لاابالی کنوارا ہو یا درجن بھر بچوں کا طرح طرح کی پریشانیوں میں گھرا ہوا باپ ، زندگی کے کسی دکھ کو سینے سے لگائے چارپائی پہ دراز مریض ہو یا ایک نہایت تندرست و توانا شخص ، غم دوراں کا شکار کوئی مرد ہو یا گھریلو الجھنوں میں الجھی ہوئی کوئی عورت ـــــــ یکساں متاثر ہوتا ہے ۔ جسے مستقبل کا معمار کہا جاتا ہے ، ملک خواہ اقتصادی لحاظ سے بام عروج تک پہنچنا چاہتا ہو یا معاشرتی لحاظ سے ہر صورت میں لوگوں کی امید کا مرکز طلباء ، جنہیں عرف عام میں "نوجوان طبقہ" کہا جاتا ہے ، ہی ہوتے ہیں ۔

آئیے طالب علم کی اس مسلمہ حقیقت کے پیش نظر ہم دیکھیں کہ یہ طلباء جن کا دوسرا رخ گلیوں میں آوارہ پھرنا ، راہ چلتی عورتوں پر فقرے چست کرنا ، سینما تھیٹر کو اپنے وقت کا بہترین مصرف سمجھنا اور فلمی دھنوں کو زیر لب گنگناتے پھرنا ہے اپنے معاشرہ میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں ۔

ہمارے ملکی معاشرہ کی سب سے بڑی خامی اس کے افراد کی جہالت ہے ۔ ایک موٹے اندازہ کے مطابق ہمارے وطن عزیز کے اسی فیصد سے زائد باشندے ان پڑھ ہیں ۔ بقیہ بیس فیصد سے بہت کم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اکثر صرف چند جماعتیں پڑھے ہوئے اور معمولی علم کے مالک ہیں ۔ ان اعداد و شمار اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ علمی مفلسی معاشرے میں کیا کیا برائیاں پیدا کر رہی اور کر سکتی ہے ۔ طلباء تعلیم عام کرنے کے سلسلہ میں اپنی مساعی کو بروئے کار لا سکتے ہیں ۔ تعلیم عام کرنے سے میری مراد یہاں یہ نہیں کہ وہ سکولز ، کالجز اور یونیورسٹیز کھولیں اس لئے کہ یہ بات ان کے قبضہ اقتدار سے باہر ہے ۔

انسان کی فطرت ہے کہ جس شے سے شروع میں لگاؤ پیدا ہو جائے زندگی کے آخری لمحات تک اس شے سے اس کا انس قائم رہتا ہے ـــــــ چھوٹے بچوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے دلچسپی پیدا کر کے ان کے

مستقبل کو سنوارا جا سکتا ہے اور جب نئی پود کا مستقبل سنور جائے تو پھر ملک و قوم کے لئے کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔ خطرہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ موجودہ تجربہ کار لوگوں کی جگہ لینے کے لئے پہلے سے تیار افراد موجود ہوں۔

بالغوں کو ابتدائی تعلیم حاصل کرانے میں طلباء خود مدد دے سکتے ہیں۔ ویسے بھی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ان پڑھ لوگوں میں شدید ہوتی ہے وہ بتائی ہوئی ہر بات کو بڑے غور سے سنتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ —— اگر معاشرہ کے ہر فرد کو اپنے ہاتھ سے دستخط کرنا اور بعض بنیادی باتیں سکھا دی جائیں تو میں سمجھتا ہوں معاشرہ پر طلبہ کا یہ وہ احسان ہے جسے کوئی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ نیز اس طرح علم سے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی پیروی کر کے وہ آخرت میں بھی سرخروئی حاصل کر سکیں گے

ہماری سوسائٹی میں ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ اس کے افراد اپنی ہر جائز و ناجائز بات منوانے کے لئے اپنے افسرانِ بالا پر ہر جائز و ناجائز طریق سے دباؤ ڈالتے ہیں —— ہڑتال ایک عام بیماری ہے جس کے جراثیم معاشرہ کے ہر طبقہ میں بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ مزدور ہوں یا ڈاک و تار کے کارکنان، ریلوے کے ملازمین ہوں یا بسوں کے ڈرائیورز، کلینرز، ہر کوئی سمجھتا ہے کہ ہڑتال ہی سے وہ اپنے مطالبات منوانے میں کامیاب ہو سکتا ہے، دوسرا کوئی رستہ نہیں —— اس میدان میں طلبہ پیش پیش ہیں جو بعض ملک دشمن عناصر یا کم از کم دشمنانِ حکومت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر ناچنے لگ جاتے ہیں ادھر سے ذرا شہ ملی انھوں نے اپنے مطالبات کی ایک لمبی چوڑی فہرست کے پس پردہ ان کالی بھیڑوں کے مشورہ پر چل کر ملک میں ہنگامہ آرائی شروع کر دی، کہیں کلاسوں میں حاضر ہونے سے انکار کیا جا رہا ہے، کہیں کالجوں اور دیگر سرکاری عمارات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہیں پولیس اور سرکاری حکام کا مقابلہ کیا جا رہا ہے اور کسی جگہ حکومت کے خلاف نعرے لگائے جا رہے ہیں

یوں لگتا ہے جیسے وہ نہیں جانتے کہ ان مظاہروں کا نقصان کس حد تک ناقابلِ تلافی ہے —— ان کے انتہائی قیمتی وقت کا ایک کثیر حصہ ہڑتالوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ ان کے والدین جو انہیں سکولوں، کالجوں میں اس لئے بھجواتے ہیں کہ وہ پڑھ لکھ کر معاشرہ کا مفید جزو بن سکیں، خون پسینہ ایک کر کے کمایا ہوا روپیہ ضائع ہو رہا ہے اور ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا گلشن اجڑ رہا ہے۔ لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ان ہتھکنڈوں میں پھنس کر اپنا مستقبل تاریک کر لیتے ہیں۔ اور یہ طلباء جنہوں نے کل اپنے ملک کی نیّا کا کھیون ہار بننا تھا خود اپنے ہی ہاتھوں سے اسے دریا کی تہہ میں پہنچا دینے کا سبب بن جاتے ہیں۔

کاش وہ ان ہڑتالوں کے ضرر رساں اثرات کا صحیح رنگ میں اندازہ لگا سکیں اور اپنے اندر یہ احساس

پیدا کرلیں کہ ان کی قوم وملت کا وقار محض کھوکھلی نعرہ بازی میں برتری لے جانے میں نہیں بلکہ عملی طور پر کچھ کر دکھانے میں ہے۔

ان حقائق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر طلبہ اپنی اس قبیح عادت کو ترک کر دیں تو جہاں یہ بات معاشرہ کے مختلف الخیال لوگوں کے درمیان منافرت ومخاصمت کو ختم کر کے امن وآشتی کے دور کے آغاز کا سبب بن جائے گی وہاں خود طلباء کے حق میں بھی ہر لحاظ سے بڑی مفید ہوگی۔

ہمارے موجودہ معاشرے نے ہماری ذہنی اقدار کو اس قدر بگاڑ کر رکھ دیا ہے کہ دولت ہی ہماری محبت کا مرکز بن کر رہ گئی ہے۔ جس کے پاس دو ٹکے ہوتے ہیں ہم اس سے محبت اور غریبوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اس طرح امیر وغریب، سرمایہ دار اور مزدور، حاکم اور محکوم دو طبقات پیدا ہو چکے ہیں جن کا وجود معاشرے کے لئے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی معاشرہ کو مثالی قرار دیا جا سکتا ہے جس میں امارت وفقر کے لحاظ سے لوگوں میں کسی قسم کا امتیاز نہ کیا جائے بلکہ اسکی بنیاد آیت قرآنی إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ پر ہو ــــــ اس مقصد کے حصول کے لئے طلباء کی کوششیں بڑی ممد ومعاون ہو سکتی ہیں ــــــ طالب علم اپنے فالتو وقت میں بچوں کے دل میں بڑوں کی عزت کا جذبہ محض چھوٹی چھوٹی داستانیں سنانے اور مؤثر نصائح کرنے سے پیدا کر سکتا ہے ــــــ وہ تنگ وتاریک گلیوں میں پلنے والے تہذیب سے بے نیاز بچوں کو بڑوں کی عزت کا درس دے کر انہیں خوش گفتار خوش اخلاق اور معاشرے کا ایک اچھا فرد بنا سکتا ہے ــــــ وہ ان کے ذہن میں بچپن سے ہی باآسانی یہ بات راسخ کر سکتا ہے کہ کسی کی عزت کا انحصار اسکی مال ودولت پر نہیں بلکہ اس کے علم وعمل پر ہے۔ خوش اخلاقی پر ہے اور ملنساری پر ہے ــــــ امیر بچوں تک کسی منظم طریق سے وہ یہ پیغام پہنچائیں کہ خدا نے سب انسانوں کو برابر پیدا کیا ہے۔ کوئی ان میں سے کسی پر اس لحاظ سے فوقیت نہیں رکھتا کہ وہ عالی شان کوٹھیوں، بنگلوں اور ملبی کاروں کا مالک ہے اور دوسرا ایک کچے مکان میں رہتا ہے اور پیدل ادھر ادھر جاتا ہے اور نہ ہی اس امر میں کسی کی افضلیت کا راز پوشیدہ ہے کہ دن میں کئی مرتبہ اس کے سامنے بڑی عمدہ غذائیں پیش کی جاتی ہیں اور دوسرے کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا۔ بلکہ وہ تمام افراد جو معاشرہ کی ترقی وبہبود کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق کوشاں ہیں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔

بظاہر یہ کام خاصہ مشکل ہے مگر طلبہ کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتا جب کہ اس فصل کے مفعول بچے ہوں گے ــــــ بچے جن کے ذہن صاف ستھری سلیٹ کی مانند ہوتے ہیں جس پر جس کا جی چاہے آکر اپنی مرضی کے مطابق

جو چاہے لکھ ڈالے۔

میرے خیال میں اس طریق سے جو باہمی محبت و اخوت معاشرے کے افراد میں پیدا ہوگی وہ معاشرے کے ارتقا اور بہتری کے لئے ایک طاقتور عامل ثابت ہوگی۔

خدمتِ خلق ایک ایسا جذبہ ہے جس کا فائدہ دوسرے کو تو خیر جو پہنچتا ہے سو پہنچتا ہی ہے خود کو قلبی طمانیت پہنچاتا ہے اور ساتھ ہی دل میں خوشی کا ایسا احساس پیدا کر دیتا ہے جو اکثر اوقات بہت جدوجہد کے بعد حاصل ہونے والی خوشی سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے ——— وہ خوشی جسے الفاظ کی لڑیوں میں پرونا ناممکن ہے۔ پس ہمارے معاشرہ کی اصلاح کے لئے ہمارے طالب علم کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق کا بہ وقت جذبہ اپنے اندر رکھتا ہو۔

ایک شخص دور سے آیا ہے، اس شہر میں اجنبی ہے۔ کسی عزیز کا گھر ڈھونڈھ رہا ہے مگر مکان نہیں ملتا۔ بوکھلائے انداز میں کبھی اس گلی میں مڑ جاتا ہے کبھی دوسری میں۔ اس کے قریب سے بہت سے لوگ گزرتے ہیں مگر کسی کو احساس نہیں۔ ایسے میں ایک طالب علم اس کی مدد کو لپکتا ہے مؤدبانہ طریق سے گھبراہٹ کا سبب دریافت کر کے اسے اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

سڑک پر ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا جا رہا ہے۔ موٹر گاڑیوں۔ تانگوں، بگھیوں اور سکوٹروں کا شور لمحہ بھر کے لئے اسے یہ احساس نہیں ہونے دیتا کہ سڑک خالی ہے۔ وہ اپنی بے نور آنکھوں سے سڑک کی طرف دیکھتا ہے ——— اس کے چہرے سے بے چارگی عیاں ہے۔ لوگ آ رہے ہیں جا رہے ہیں مگر اپنی ہی دھن میں مگن ——— کسی کو اپنی ماں کا خیال ہے تو کسی کو اپنے ننھے منّے بچوں کا، کوئی اپنی بیوی کے انتظار کا احساس کر کے بھاگا جا رہا ہے تو کوئی کسی ناگہانی افتاد کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی تدبیر کرنے گھر سے نکلا ہے ——— ایسے میں اندھے کی فکر کون کرے؟ اسکی مجبوری و معذوری اور بے کسی کا خیال کس کو آئے! ایک راہ چلتا طالب علم ایسے مواقع پر اس کے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہو سکتا ہے۔

برسات کا موسم ہے پانی کناروں سے اچھل کر باہر آ چکا ہے۔ طغیانی کا زور ہے غمِ دوراں میں الجھے ہوئے لوگ بھلا ایسے میں کسی کی کیا مدد کریں گے۔! طالب علم ایسے وقت میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ کمر ہمت کس کر نکل کھڑا ہو۔ کمزور کی مدد کرے۔ لاچار کا سہارا بن کر زندگی کا دامن پکڑنے میں اس کا ممد و معاون ہو اور اس کے جیون کی قریب الغرق کشتی کو کنارے سے لگا کر اس کی پر خلوص دعاؤں کے طفیل آسمان والے سے اپنے اس عمل صالحہ کا اجر پائے۔

بظاہر یہ باتیں کتنی چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن عین ممکن ہے انہی واقعات کو دیکھ کر اردگرد کے لوگوں کے مردہ ضمیر دوبارہ زندگی حاصل کر پائیں۔ اور انسانیت کے لئے اپنے آپ کو مفید ثابت کر سکیں ——— اس صورت میں ان کی اس نیکی کے اس محرک ——— طالب علم کی کوششوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

طلباء معاشرتی کاموں (SOCIAL WORKS) میں حصہ لیتے ہوئے اپنی مثال پیش کر کے لوگوں کے دلوں میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں اور جب یہ جذبہ بیدار ہو جائے تو پھر انسان واقعی ایسے کام کر لیتا ہے جو اسے صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات کے لقب کا حقدار ثابت کر دیتے ہیں۔ (اس ضمن میں پشاور یونیورسٹی کے طلباء کی مثال خصوصاً قابل غور ہے)

میرے نزدیک اگر صرف یہی چند ایک باتیں ہمارے طلبار کے اندر پیدا ہو جائیں اور وہ اپنے فرائض کو صحیح طور پر سمجھنے لگیں تو چند دنوں میں معاشرہ کہیں کا کہیں پہنچ سکتا ہے۔

کاش ہمارے وطن کے نوجوان واقعی ایسے مثالی وجود بن سکیں جن سے ابتداء میں معاشرہ متاثر ہوتا ہے اور پھر وہ ملک کے لئے ایک مایہ ناز سپوت ثابت ہوتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ ایسے ملک وملت کے قابل فخر نوجوان دوسرے لوگوں کے لئے باعث رحمت ہوتے ہیں بلکہ وہ خود بھی علم کا چراغ عمل کی لو سے روشن کر کے حصول علم کے اصل مقصد کو فوت ہونے سے بچا لیتے ہیں۔

حُسن و جمال!

تم خواہ کتنی ہی حسین پوشاک کیوں نہ پہنا دیئے جاؤ یہ خیال نہ کرنا کہ حسن و جمال پوشاک میں ہوتا ہے حقیقتہً حسن و جمال تو خیر و کرم کے وہ سرچشمے اور وہ بلند کارنامے ہیں جو تم کو عزت و سرداری سے سرفراز کریں (عمر بن معدیکرب)

(مرسلہ ملک مبارک احمد (ایف ایس سی))

عبدالسبحان

سگریٹ نوشی ـــــ ایک ترقی یافتہ لعنت

نامور ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کی نظر میں!

اگرچہ ہمارے ملک میں تمباکو نوشی کا رواج تو زمانہ قدیم سے جاری ہے۔ لیکن جوں جوں زمانے نے ترقی کی ہے توں توں تمباکو نوشی نے بھی۔ اب زمانۂ جدید نے تمباکو نوشی کو آسان اور سہل بنا دیا ہے۔ پہلے تو حقہ ہی استعمال میں آتا تھا مگر اب اس سے بھی زیادہ مہلک طریقہ رائج ہو گیا ہے یعنی سگریٹ نوشی۔ یہ اس لئے حقہ کی نسبت زیادہ مہلک ہے کہ اس میں دو نہایت ہی زہریلے عناصر پائے جاتے ہیں۔ نکوٹین اور اکیرولین (ACROLEIN) حقہ میں اکیرولین تو پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اور نکوٹین کی مقدار نہایت ہی خفیف ہوتی ہے کیونکہ تمباکو کا دھواں پہلے پانی میں سے ہو کر آتا ہے اور اس طرح نکوٹین پانی میں جذب ہو کر نکوٹینک ایسڈ (NICOTINIC ACID) بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس سگریٹ کی تمام پیدا شدہ نکوٹین پھیپھڑوں اور دوسرے اندرونی حصوں میں جذب ہو کر ان پر نمایاں عمل کرتی ہے۔

اگر اس بارے میں ذرا بھی غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ سگریٹ نوشی اور حقہ نوشی دونوں ہی شرعی لحاظ سے ناجائز ہیں۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے کہ تم نشہ اور صحت کو بگاڑ دینے والی چیزوں سے اجتناب کرو فضول خرچی میں بھی اس کا اور کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تمباکو نوشی کرنا تو گویا نوٹوں کو آگ لگانا ہے پھر اس سے صحت بھی خراب ہوتی ہے اور اسراف سے بھی اللہ تعالیٰ نے ہم کو منع فرمایا ہے۔ پس ان تمام امور سے ظاہر ہوا کہ تمباکو نوشی ایک لعنت ہے۔

نہ صرف سگریٹ پینے والا ہی مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوگا بلکہ آئندہ نسل بھی کئی قسم کی برائیوں کا شکار ہو جائیگی آج کل اوسط عمر میں کمی، دل کے دورے اور کئی دوسرے امراض صرف تمباکو نوشی ہی کی وجہ سے ہیں اور تجربات نے یہ واضح کر دیا ہے کہ پھیپھڑوں کے کینسر کے اکثر و بیشتر مریض صرف تمباکو نوشی ہی کا شکار ہوتے ہیں۔ سائنسدانوں نے

تجربات کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمباکو کے جلنے سے نہ صرف نکوٹین ہی پیدا ہوتی ہے بلکہ کاربن مونو آکسائڈ گیس کی بھی بہت بڑی مقدار پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ ایک گرام تمباکو کے جلنے سے قریباً ۸۰ مکعب سنٹی میٹر صرف کاربن مونو آکسائڈ ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ کاربن مونو آکسائڈ بہت زہریلی ہوتی ہے۔ اکثر آپ نے بھی دیکھا یا سنا ہوگا کہ فلاں جگہ بند کمرے میں اتنے نفوس مردہ پائے گئے۔ کیونکہ انھوں نے بند کمرہ میں کوئلے سلگائے تھے۔ وغیرہ وغیرہ جلنے کے عمل سے کوئلوں سے کافی مقدار میں کاربن مونو آکسائڈ گیس تیار ہوتی ہے۔ یہی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔ نکوٹین اور کاربن مونو آکسائڈ گیس کے علاوہ بھی کئی مہلک عناصر تمباکو جلنے سے ظہور میں آتے ہیں۔ مثلاً امونیا گیس۔ سلفیوریٹڈ ہائیڈروجن پیریڈین کے مرکبات: کاربالک ایسڈ۔ متھین گیس اور کئی دیگر زہریلے مادے۔ یہ اس بات کی حقیقت واضح کرتے ہیں کہ نہ صرف تمباکو نوشی ایک زہر ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ نہ جینے ہی دیتا ہے نہ مرنے ——

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جب سگریٹ کا دھواں انسان کے جسم کے اندر داخل ہوتا ہے۔ تو بعض عناصر فوری طور پر جذب ہو کر خون کے دباؤ میں نمایاں کمی کر دیتے ہیں۔ اس طرح دل کو دوران خون معمول پر لانے کے لئے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اگرچہ سگریٹ پینے کی ابتدا میں جسم کو ایک خاص تقویت پہنچتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کے فوراً ہی بعد ردِ عمل طبیعت کو سست اور کاہل بنانا شروع کر دیتا ہے اور مزید سگریٹ وغیرہ پینے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح عادت میں پختگی اور کام میں کاہلی بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔

ایکرولین (ACROLEIN) گیس دماغ کے لئے خاص طور پر مضر ثابت ہوئی ہے یہ بھی شراب کی طرح دماغ کو بگاڑنے کا مادہ رکھتی ہے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سگریٹ کے بغیر کوئی کام کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ پہلے سگریٹ پھر کام، اکثر یہ تو دیکھا گیا ہے کہ کثرت سے سگریٹ پینے کے دلدادہ کھانا کھانے کے بعد۔ پڑھائی کے اوقات میں۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی غرض ہر کام کی ابتداء میں حتیٰ کہ رفع حاجت کے وقت بھی سگریٹ پیتے ہیں۔ ورنہ یا تو ان کو لطف نہیں آتا۔ یا وہ کام انھیں سے سگریٹ کے بغیر نہیں ہو سکتا

جہاں تک، خون کی گردش اور دل کی حرکت کا تعلق ہے سگریٹ پینے والوں کا دوران خون کافی حد تک عام لوگوں سے بہت کم ہوتا ہے۔ سگریٹ پیتے وقت دل تیزی سے دھڑکتا ہے اور خون کا دباؤ بھی بڑھ جاتا ہے اس لئے اکثر سگریٹ پینے والوں کو بلڈ پریشر کی شکایت ہوتی ہے۔ تین سگریٹ پینے کے بعد خون کا دباؤ قریباً بیس درجہ بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ورزش کے فوراً بعد عام لوگوں کے دل کی حرکت معمول پر آجاتی ہے۔ لیکن سگریٹ پینے والوں کے دل آہستہ آہستہ اپنی پہلی حالت میں آتے ہیں۔

نکوٹین کے ضمن میں کہ یہ کتنی زہریلی ہوتی ہے یوں موازنہ ہو سکتا ہے کہ اس کے ایک گرین کا پندرھواں حصّہ ایک اچھے بھلے آدمی کو موت کی نیند سلا سکتا ہے۔ جب کہ چوہے مارنے والی دوا کی آدھے گرین کی اتنی ہی طاقت ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک بہت بڑے سائنسدان ایڈیسن نے تمباکو کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ :۔

"اگرچہ سگریٹ کا دھواں قویٰ پر عمل کر کے ان میں تیزی پیدا کرتا ہے۔ تاہم فوراً ہی بعد یہ تیزی سُستی اور کاہلی میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس پیدا شدہ سستی کو ختم کرنے کے لئے اعضاء اور سگریٹ پینے پر مجبور کرتے ہیں اور یہ عمل جاری رہتا ہے۔ جو اس مرض میں مبتلا ہو جائے وہ نت نئے امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے میں کبھی کسی تمباکو نوش کو اپنے تجربہ گاہ میں نہیں آنے دیتا۔"

دُنیا کی بڑی بڑی نامور ہستیوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ کسی تمباکو نوش پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اور کرنا بھی نہیں چاہیئے۔ بچپن میں اس کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ یہ عادت پختہ ہونے کے بعد کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ مکمل سدّباب نہ کیا جائے۔

اکثر مصنفین نے یہ رائے دی ہے کہ مجرموں میں سے ۹۹ فی صد تمباکو نوشی کے عادی ہوتے ہیں جس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تمباکو نوشی انسان کی عادات اور خصلتوں پر بھی بُری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ بچوں میں آوارگی۔ بری محلسوں میں بیٹھنا اور پڑھائی سے دور بھاگنا یہ سب سگریٹ ہی کی پیدا کردہ چیزیں ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ اس برائی کو پھیلانے کا محرک کون ہے؟ تو یہ خود نوجوان اور بڑے آدمی ہیں جو کہ بازاروں اور دکانوں میں شارع عام سگریٹ نوشی کر کے بچوں میں اس کی نقل کا بیج بوتے ہیں۔ اسی لئے نوجوانوں کی ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ اوّل تو سگریٹ وغیرہ بالکل نہ پئیں۔ لیکن اگر کوئی اس لعنت سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ تو کم از کم اتنا تو ضرور کرے کہ شارع عام پینے سے احتراز کرے۔

تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ ستر سال سے کم عمر میں سگریٹ نوشی کا اثر زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن بچپن میں بہت ہی زیادہ اور ستر سال کے بعد اس کا اثر بالکل ہی زائل ہو جاتا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض سگریٹ بنانے والی فرمیں کسی ڈاکٹر یا نامور کھلاڑی کا حوالہ دے کر یہ کہتے ہیں کہ فلاں سگریٹ واقعی بے ضرر ہے یا وہ اسے پسند کرتا ہے۔ حالانکہ یہ بے بنیاد چیزیں ہیں کوئی سگریٹ

بے ضرر نہیں ہو سکتا۔ سگریٹ اور بے ضرر ہونا سفید جھوٹ بولنا ہے تمباکو کا دھواں کسی ٹانک کا نام نہیں بلکہ نڈیوں میں رس جانے والے ایک ایسے زہر کا نام ہے جو ایک دفعہ چکھنے کے بعد ہمیشہ ہی چکھا جاتا ہے۔ جسے آج کل کی پود ناسمجھی، بے وقوفی، کی وجہ سے کثرت سے استعمال کرتی ہے۔ اور پھر بعد میں کہتے ہیں کہ میں نے یہ کیا ظلم کیا۔ کہ سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی۔ وہ بہت زور لگاتے ہیں کہ کسی طرح اس کا سدِ باب کریں۔ مگر

اب پچھتائے کیا ہوت !
جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

روزانہ لاکھوں روپیہ تمباکو سگریٹ اور حقہ کی بھینٹ چڑھ کر دھوئیں میں تبدیل ہو جاتا ہے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

اس طرح لوگ نہ صرف تمباکو نوشی سے ہوا کو گندہ کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ اپنی اور اپنی قوم کی صحت کو تباہ کرنے کے جرم کے بھی ہیں۔ لیکن اگر یہی کثیر رقم کسی اور قومی مفاد کے لئے استعمال کی جائے تو ملک کی ترقی بھی ہو سکتی ہے اور نسلِ انسانی کی صحت کے اعتبار سے بہتری بھی۔

پچھلے دنوں برطانیہ کے وزیرِ صحت نے یہ اعلان کیا تھا کہ تمباکو نوشی کا خاتمہ کرنے کے لئے حکومت ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے سگریٹ نوشی کے تمام اعلانات کی تشہیر پر پابندی عاید کر رہی ہے تاکہ بڑھتی ہوئی پھیپھڑوں کے سرطان کی بیماری پر قابو پایا جا سکے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے وزیرِ صحت جناب کینتھ رابنسن نے یہ بھی کہا کہ ان کی حکومت دیگر تمام ذرائع پر بھی پابندی عاید کر دے گی جن سے سگریٹ نوشی کی تشہیر ہوتی ہے۔

کبھی بھول کر کرو نہ کسی سے سلوک ایسا
جو کوئی تم سے کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

(مرسلہ سعید احمد سال چہارم)

گلہائے رنگارنگ

خلیل الرحمٰن شاہ

حسن محمد خاں عارف

محشر

عبدالشکور انظہر

نسیم احمد سیفی

مقبول احمد سلیمی

خلیل الرحمٰن شاہ
بی اے سی سی

"اسے کیا کہیئے"

ولیمہ ہوئے بھی پانچ دن گزر گئے۔ سوائے چند نزدیکی رشتہ داروں کے سب مہمان رخصت ہو چکے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ بھی اُس شام کی گاڑی سے روانہ ہونے والے تھے ـــــ لیکن ایک صاحب جو اس شام کو بھی نہیں گئے تھے یہ تھے میرے دوست نورالٰہی، کافی جائداد کے مالک ہیں اور ایک بنک میں منیجر بھی۔ ان کو میں نے خود ہی ایک ہفتہ گزارنے کی دعوت دی تھی۔ کافی پروقار شخصیت ہیں اور عموماً سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ نیند بہت آتی ہے، صبح دیر سے اٹھتے ہیں۔ ان کے ساتھ منشی کرم دین بھی تھے۔ میرے خیال میں تو انہیں منشی کی بجائے پرائیویٹ سیکرٹری کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ روایتی منشیوں کی بغیر کالر کی قمیض، میلی اچکن اور تہبند کے بالکل برعکس کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ دونوں کو دوسری منزل پر متصل کمروں میں ٹھہرایا گیا تھا۔

اُس شام کو باقی رشتہ دار بھی چلے گئے اور صرف میں میری بیوی اور وہ دونوں رہ گئے۔ کھانے کے بعد رات کو کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں جو کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھیں میں اپنی بیوی نسرین کو نیچے چھوڑ آیا اور منشی کرم دین اپنے کمرے میں چلے گئے بارہ بجے کے لگ بھگ نور صاحب بھی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں کافی دیر تک اپنی کرسی پر بیٹھا رہا اور پھر شاید وہیں نیند آگئی۔ رات کو کسی کے جھنجھوڑنے سے میری آنکھ کھل گئی یہ نور صاحب تھے جو کہ بہت گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔ کہنے لگے میں نے ایک بہت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے اور معلوم ہوتا ہے میری بیوی سخت بیمار اور تکلیف میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ابھی گھر چلا جاؤں۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا کہ صبح چلے جانا لیکن وہ نہ مانے میں نے انہیں بتایا کہ اب تو ان کو چار بجے والی گاڑی ہی مل سکتی ہے۔ لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور جلدی جلدی کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ کہنے لگے کہ منشی جی کو صبح کی گاڑی سے بھیج دیں میں ان کی نیند خراب کرنا نہیں چاہتا۔ میرے لئے یہ بات کافی حیران کن تھی۔ کیونکہ منشی جی کے بغیر تو وہ کبھی سفر پر جاتے ہی نہ تھے۔

میں نے کار نکالی اور انہیں سٹیشن پر لے گیا۔ ابھی گاڑی آنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ مگر انہوں نے مجھے زبردستی واپس بھیج دیا اور میں گھر آکر سو گیا۔

صبح جب میں جاگا تو نسرین پہلے ہی اٹھ چکی تھی۔ منشی جی چہل قدمی سے واپس آئے ناشتہ کی میز پر نسرین نے مجھ سے نور صاحب کے متعلق پوچھا میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ منشی جی کہنے لگے مجھے چھوڑ کر تو وہ آج تک نہیں گئے اور پھر میں تو ان کے ساتھ والے کمرے میں سو رہا تھا کم سے کم مجھے اطلاع ہی دے دی ہوتی" اور پھر مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے ان کے ساتھ کوئی بھونڈا مذاق کیا ہو۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد دوبارہ بولے اور پھر ریزروڈ ٹکٹ بھی میرے پاس ہیں" ناشتہ کے بعد وہ اپنی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا بعد میں میں نے منشی صاحب سے کہا کہ نور صاحب کا سامان بھی انہی کو لے کر جانا ہے انھوں نے سامان کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر سامان الٹنے پلٹنے کے بعد پھر بولے" وہ تو اپنا بٹوہ تک ساتھ نہیں لے گئے" اور مجھے دوبارہ مشکوک نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا بہرحال تھوڑی دیر کے بعد ان سے نجات پائی اور ڈرائیور کو کہہ دیا کہ انہیں سٹیشن پر چھوڑ آؤ۔

نو بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رسیور اٹھایا اور ہیلو کہا دوسری طرف سے بیگم نور بول رہی تھیں، لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے بہت سخت تکلیف میں ہیں" کیا نور صاحب ابھی روانہ نہیں ہوئے "

"میں نے تو انھیں صبح کی گاڑی پر بٹھا دیا تھا"

"میرے خیال میں تو صبح سات بجے سے پہلے کوئی گاڑی وہاں سے نہیں چلتی۔ خیر اگر چل دیئے ہیں تو پہنچ جائیں گے شاید گاڑی لیٹ ہو گئی ہو"

"ہاں" میں نے کہا "آج کل گاڑیوں میں یہ فیشن عام ہے"

اگرچہ کوئی بات نہ تھی پھر بھی ایک نامعلوم سا خوف میرے دل میں جگہ پا چکا تھا۔ آخر کیوں نور صاحب ابھی تک گھر نہ پہنچے تھے۔ اور کیوں یہ صورت ڈرامائی کیفیت کی حامل ہو رہی تھی۔ بہرحال میں نے گفتگو جاری کرنے کے لئے کہا میں نے انہیں چار بجے کی ریل کار پر سوار کرا دیا تھا"

"اول تو وہ چار بجے اٹھتے ہی نہیں۔ اگر اٹھ بھی گئے ہوں تو ایک گھنٹہ پہلے انہیں یہاں پہنچ جانا چاہیئے تھا" اس کے لہجے سے پریشانی اور ایک انجانے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے ذرا سنبھلتے ہوئے کہا" وہ سٹیشن سے سیدھے آفس چلے گئے ہوں گے"

"لیکن آفس والوں نے تو مجھے ابھی ابھی فون کیا ہے کہ وہ وہاں نہیں پہنچے ہیں اب میں کیا کروں یا میرا خاوند!؟" لیکن عورتوں کی مجھے یہی بات ناپسند ہے۔ کچھ ہوا ہو یا نہ۔ یہ بات کا بتنگڑ ضرور بنائیں گی "میرا خاوند" اُف خدایا یوں بین کر رہی ہے جیسے وہ واقعی مر گیا ہو۔ مگر خیالات آگے نہ بڑھ سکے "مر گیا ہو" الفاظ نے دوبارہ ذہن پر دستک

دی "مر گیا ہو" مجھے پسینہ آگیا۔

رات کو نور صاحب کے ساتھ آخری شخص میں ہی گنا جاؤں گا۔ میں انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ نسرین بھی آکر میرے ساتھ کھڑی ہو گئی میں نے اپنے آپ پر قابو پاکر کہا "ہو سکتا ہے وہ بازار چلے گئے ہوں" حالانکہ مجھے پتہ تھا کہ وہ یہیں چھوڑ گئے ہیں۔ نسرین بھی مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔ بیگم نور نے کہا "ہائے ان کو کچھ ہو گیا ہو گا انھوں نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا" اور پھر رونے لگیں۔

پھر کہا "منشی جی تو سیدھے گھر آتے ہیں وہ بھی نہیں آئے"

میں حیران تھا کہ ان کو کیسے کہوں کہ منشی جی تو ساتھ ہی نہیں گئے تھے۔ مگر دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا کہ منشی جی سات بجے والی گاڑی سے آئیں گے۔

انہوں نے ذرا ضبط کر کے کہا "میں دوپہر تک انتظار کروں گی اور پھر پولیس کو اطلاع دے دوں گی" اور دوبارہ رونے لگیں میں نے ریسیور رکھ دیا اور نسرین کی طرف دیکھا۔ مجھے منشی جی کی معنی خیز نظریں یاد آگئیں۔ نسرین بھی کچھ کچھ سمجھ گئی تھی پوچھنے لگی کون تھا میں نے بتا دیا کہ بیگم نور تھیں۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ نور صاحب ابھی گھر نہیں پہنچے اور پھر نسرین کے مزید پوچھنے پر سب کچھ بتا دیا۔ جوں جوں حالات اسکی سمجھ میں آرہے تھے اس کے چہرہ کی رنگت تبدیل ہوتی جارہی تھی۔ اور آخر اس کا رنگ بالکل زرد ہو گیا۔ میں نے بھی اپنی نظریں جھکا لیں۔ وہ میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور میرے شانوں پہ ہاتھ رکھ کر کہا "آپ ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں"

میں نے کہا "نہیں نسرین! میں نے سب کچھ درست بتا دیا ہے" اور پھر اس کو کچھ دلاسا دے کر مطمئن کر دیا۔

اس دن میں دفتر بھی نہ جا سکا۔

ایک بجے کے قریب خادمہ نے اطلاع دی کہ باہر کوئی آیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں ابھی آتا ہوں۔ میں جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو بھانپ گیا کہ سادہ لباس میں یہ کوئی پولیس والا ہی ہے۔ "کیا آپ کا نام یہی ہے" اس نے مجھے کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو آپ ہی مسٹر نور کو گاڑی پر سوار کرنے گئے تھے"

"جی ہاں"

"اور آپ کو یہ بھی پتہ ہے کہ وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچے"

"جی ہاں"

"اور آپ کو یہ بھی پتہ ہوگا کہ صبح گاڑی میں بھیڑ بہت کم ہوتی ہے۔ جتنے مسافر ہوتے ہیں ان کے ٹکٹ راستہ میں چیک کی جاتی ہیں"

"جی ہاں"

"لیکن آج مسٹر نور کے حلیئے کا کوئی آدمی ٹکٹ چیکر کو نہیں ملا"

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات کو معمول پر لاتے ہوئے کہا" ہوسکتا ہے ٹکٹ چیکر کو غلطی لگ گئی ہو۔ کیونکہ اس وقت ذرا اندھیرا ہی ہوتا ہے"

سادہ لباس والے نے کہا "لیکن آج یہاں سے تو اس گاڑی پر کوئی آدمی سوار ہی نہیں ہوا چونکہ ہم نے بکنگ کلرک سے پتہ کرالیا ہے" میری پیشانی پر پسینہ کی بوندیں ابھر آئیں مجھے اپنی گھبراہٹ پر کسی طرح عبور ہی حاصل نہ ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ نسرین کھڑکی کے پیچھے کھڑی یہ سب کچھ سُن رہی ہے۔

اُس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا" آپ کا کہنا ہے کہ آپ گاڑی چھوٹنے سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی چلے آئے اور یہ کہ آپ کو پورا یقین ہے کہ وہ اسی گاڑی پر سوار ہوئے ہوں گے۔ لیکن یہ سب کچھ آپ ثابت نہیں کر سکتے" اس کے لہجے سے کوئی خاص بات ظاہر نہ ہوتی تھی لیکن مجھے معلوم ہوتا تھا کہ دراصل یہ سب کچھ مجھ پر شک ہونے کا غماز ہے۔ ان سب کو شبہ تھا کہ میں نے نور صاحب کو کوئی گزند پہنچائی ہے۔ مجھ پر اس بات کے غصہ اور شدید رنج سے عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ گویا آنسو گرنا ہی چاہتے ہیں۔ مگر میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا اور خاموش رہا۔

اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا" آپ کو حالات کی نزاکت کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ اور میرے خیال میں آپ کچھ عرصہ کے لئے مجھے اپنا مہمان رکھیں گے۔"

میں نے اپنے چہرہ پر مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے کہا "ضرور" اس کا جواب اس نے عجیب مسکراہٹ سے دیا میں باہر آگیا اور خادمہ کو اس بات کی اطلاع دے دی۔

میں اپنے کمرے میں گیا وہاں نسرین اداس بیٹھی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ شاید نسرین کا خیال تھا کہ میں اُس سے کوئی بات کروں گا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے کچھ کہا تو گلا رندھ جائے گا۔ اس لئے میں کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر میری کرسی پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی "آپ اپنی زبان سے مجھے یقین دلادیں کہ آپ نور صاحب کے متعلق سچ کہہ رہے ہیں"

میں نے کہا "نسرین! تم لوگوں کو خدا جانے کیوں وہم ہوگیا ہے کہ میں نے نور صاحب کو کوئی گزند پہنچائی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تم سب مجھے قاتل سمجھتے ہو تو سنو میں نے نہ آج تک کسی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی کبھی کسی کو قتل کرنے

کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور پھر نور صاحب کو ——— اپنے بہترین دوست کو قتل کرنے سے میرا کوئی مقصد بھی حل نہیں ہوتا۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھ پہ بھروسہ کرو گی اور میرے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاؤ گی جو کہ یقیناً ہماری لازوال محبت کی نشانی ہے"۔ اس نے میرے ہاتھ کو دبا کر مجھے اپنے اعتماد کا یقین دلا دیا۔ تھوڑی دیر بعد منشی جی پھر آن دھمکے۔ ان کی نگاہیں کہتی تھیں میرا تو پہلے ہی یہی خیال تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ انہوں نے آکر بتایا کہ پولیس والوں نے شہر میں سارے حادثات کی تحقیق کر لی ہے لیکن ان میں بھی نور صاحب نہیں ہیں اور ہوتے بھی کیسے وہ تو گاڑی پر گئے ہی نہ تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ سادہ لباس والا ہمارے گھر میں ہماری ہی نگرانی کے لئے ٹھہرا ہوا ہے۔ پولیس والوں نے ہمارے سٹیشن کے ساتھ والے علاقوں کو چھان مارا تھا۔ اور اسی انتظار میں تھے کہ انھیں "لاش" ملے اور مجھے پکڑ کر لے جائیں سادہ لباس والا چاہتا تھا کہ وہ میری غیر موجودگی میں نسرین سے پوچھ گچھ کرے لیکن میں نے اسے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ اسی اثنا میں رات ہو گئی۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جوں جوں رات گزرتی جاتی تھی۔ میرے دل میں حالات کی سنگینی اور اپنی ناامیدی کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔ طرح طرح کے اوہام اور وسوسے میرے دل میں سر اٹھا رہے تھے اور تخیل طرح طرح سے کچوکے لگا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اگر میں نے ابھی کچھ نہ کیا تو پاگل ہو جاؤں گا۔ آخر کار جب فکر برداشت نہ ہو سکا تو میں نے نسرین سے کہہ ہی دیا کہ یہاں سے بھاگ چلیں۔

اس نے کہا "جب آپ نے یہ جرم کیا ہی نہیں تو بھاگنے سے کیا فائدہ بلکہ الٹا پولیس والوں کا شک بڑھ جائے گا"

میں نے کہا "لیکن تم نہیں جانتی کہ میں کس قدر خطرے میں ہوں اور بے گناہ مارا جاؤں گا"

اس کے بعد ہم پھر چپ ہو گئے۔ میں بزدل بھی نہ تھا کہ بھاگ جاتا۔ لیکن اس وقت بے بسی ہی کچھ ایسی تھی کہ جیل کی سختیوں اور تکلیفوں کا خیال آتے ہی دل کانپ اٹھتا تھا ———

نسرین اپنے بستر پہ جا کر لیٹ گئی تھی۔ اسکی پشت میری طرف تھی اسی اثنا میں بارہ بج گئے میں چپکے سے باہر نکل گیا اور گیٹ کے سامنے ٹہلنے لگا۔ دور سے کسی موٹر سائیکل کی آواز آ رہی تھی مجھے یقین ہو گیا کہ پولیس والوں کو نشان مل گیا ہے اور یہ مجھے ہتھکڑی لگانے آ رہے ہیں ——— میں نے سوچا کہ نسرین کو ساتھ لے کر یہاں سے کسی دوسرے شہر میں چلے جاتے ہیں۔ پہلے تو وہ تیار ہی نہ ہوتی تھی لیکن میرے سخت مجبور کرنے پر وہ رضامند ہو گئی اس وقت تک کہ ہم نیچے اترتے موٹر سائیکل گیٹ کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ اس کے شور سے منشی جی اور سادہ لباس والا دونوں اٹھ کر باہر آ گئے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ موٹر سائیکل والا سیدھا سادہ لباس

والے کے پاس جائے گا۔ لیکن وہ سیدھا میرے پاس آیا اور مجھے ایک لفافہ تھما دیا میں نے جلدی سے اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بھیجنے والے کا نام پڑھا۔ شیخ نورالہٰی ! مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں اس کے آگے اور کچھ پڑھ ہی نہ سکا۔ اور تار نسرین کو پکڑا دیا۔ اس نے پڑھا۔ لکھا تھا :۔

" پیارے دوست ! آج جب میں کافی تکلیفیں جھیلنے کے بعد گھر پہنچا۔ تو گھر کا نقشہ ہی الٹ پایا۔ پوچھنے پر سب کچھ پتہ چلا اور اب تمہیں تار بھیج رہا ہوں۔ جب تم مجھے سٹیشن پر چھوڑ گئے تو بنچ پر بیٹھتے ہی مجھے نیند آگئی۔ اور پھر آنکھ صبح ساڑھے پانچ بجے کھلی سٹیشن ماسٹر سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ تھوڑی دیر میں ایک مال گاڑی آنے والی ہے۔ میں نے اسے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ مجھے اس مال گاڑی پر بٹھا دو۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔ سٹیشن ماسٹر راضی مند ہو گیا اور مجھے گاڑی آنے پر سوار کرا دیا۔ اور گاڑی میں مجھے پھر نیند آگئی۔ جب آنکھ کھلی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ اور جب گاڑی رکی تو ریلوے پولیس نے مجھے پکڑ لیا۔ ان کو بہت کچھ سمجھا بجھا کر میں نے پیچھا چھڑایا۔ اور شام کی گاڑی سے گھر پہنچا ——

فقط تمہارا دوست نورالہٰی "

تار پڑھ کر میں اور نسرین ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگے ——

ہم ہنستے ہیں لیکن ہماری ہنسی حماقت کی بنا پر ہوتی ہے حالانکہ اس دنیا کے رہنے والوں کو فی الاصل رونا چاہیئے زمانہ ہمیں اس طرح چکنا چور کر دیتا ہے جیسے ہم شیشے ہوں اور شیشے بھی ایسے کہ ان کو توڑ کر پھر جوڑا نہ جا سکے۔ (عمر بن معد یکرب)

(مرسلہ نعیم احمد جاوید سال دوم)

حسن محمد خان عارف ایم۔اے

ہم نے بھی ڈگری لی!

(پنجاب یونیورسٹی کے منتظمین سے معذرت کے ساتھ)

۱۹۴۴ء کی پرانی بات ہے کہ ہم نے دلّی یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا تھا۔ انگریز کا راج تھا۔ دلّی فرنگی کی راجدھانی تھی۔ ہندوستان کے چیف جسٹس سر مورس گوائر ہماری کانووکیشن کے مہمان خصوصی تھے۔ انہوں نے ڈگریاں تقسیم کیں۔ تین برس بعد انقلاب آگیا۔ ہم لٹے پٹے پاکستان آگئے۔ جی کئی بار چاہا کہ ایم اے بھی کرلیں مگر یونیورسٹی کے قواعد پرائیویٹ امتحان میں بیٹھنے کی اجازت ہی نہ دیتے تھے۔ اپنے حالات ایسے نہ تھے کہ زندگی کی جس ڈگر پر چل رہے تھے اس سے کنارہ کرکے دانشگاہوں کے ایوانوں میں علم کی جستجو کرتے۔ وقت بڑھتا گیا۔ عمر گزرتی گئی۔ بیسیوں بہاریں بیت گئیں۔ یکایک اطلاع ملی کہ اپنے ہی کالج میں ایم اے عربی کی تدریس کی اجازت مل گئی ہے۔ اور بھر اللہ بھلا کرے کالج کے ارباب حل وعقد کا کہ ایوننگ کلاسز جاری کرنے کی حامی بھر لی۔ زبان کا علم بہر حال ایک خصوصیت رکھتا ہے اور جب اپنے اندر اسے ٹٹولا تو معاملہ بالکل صفر تھا مگر یوں سمجھ لیجئے کہ بعض دوستوں کے کہنے کہانے داخلہ لے لیا۔

سلیبس پر نظر ڈالی تو دم بخود رہ گئے۔ یہ دو برس کیسے کٹیں گے۔ منزل بڑی کٹھن معلوم ہوئی۔ علم کے لحاظ سے اپنا حال بڑا پتلا تھا لیکن لشتم پشتم شروع کر ہی دیا۔ بڑی جان ماری پڑی خدا خدا کرکے دو برس پورے کئے۔ امتحان ہوئے اور خدا بھلا کرے یونیورسٹی والوں کا ہم بھی کامیاب طلباء کی فہرست میں تھے نتیجہ بھی عجیب پر مسرت تھا۔ اپنے کالج کے گیارہ طلبائ تھے۔ سب کے سب پاس۔ سات فرسٹ ڈویژن۔ چار سکینڈ ڈویژن۔ اور تھرڈ ڈویژن مونہہ دیکھتی رہ گئی اس کے حصے کوئی نہ آیا۔

دانش گاہ پنجاب نے فرسٹ اور سکینڈ ڈویژن والوں کو دعوت نامہ بھجوا دیا کہ وہ اپنی ڈگری یونیورسٹی کانووکیشن میں حاضر ہو کر وصول کریں۔ ۲۲ مئی کو کانووکیشن تھی اور ۲۱ کو ریہرسل۔ ہم ۲۱۔ کی صبح کو لاہور پہنچ گئے۔

نیا یونیورسٹی کیمپس وسط لاہور سے اگر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سات آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ بس کا انتظار کرتے تو وقت پر تو کیا شاید وقت کے بعد بھی نہ پہنچ سکتے اس لئے قہر درویش برجان درویش ٹیکسی لی اور آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ گئے۔ سوا دس بجے

ریہرسل کے لیے داخلہ کی اجازت ملنی تھی لیکن ساڑھے دس ہو گئے تھے ہمیں کوئی پوچھتا تک نہ تھا۔ بلکہ ہم ہی دوسروں کو پوچھتے پھر رہے تھے کہ جناب آخر ہم نے بھی ایم اے پاس کیا ہے سوا دس تو ہو لئے ہمیں بلاوا کیوں نہیں آتا۔ اس پر لاہور کے لاہوری ہمیں ایسے دیکھنے گویا کہ ہم نے ایم اے کی ڈگری نہیں لینی۔ اور یہ کہ ہم گویا دیہات سے لاہور کی مال روڈ دیکھنے چلے آئے ہیں خدا خدا کر کے ساڑھے گیارہ بجے ہمیں آواز پڑی اور ہم خوشی خوشی اندر گئے تو اندر کے منتظمین نے بڑے آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ آپ کس کے بلائے آئے ہیں۔ ہم پھر شش و پنج میں پڑ گئے اور سوچا کہ کہیں ہم سے غلطی تو نہیں ہو گئی یا پھر باہر کے منتظمین سے غلطی تو نہیں ہوئی کہ انہوں نے کسی اور کی بجائے ہمیں اندر بھجوا دیا ہو۔ ہم آنکھ بچا کر دوسرے "لڑکوں" میں گھس گھسا کر بیٹھ گئے۔ ہمارے کالج کے دوسرے ساتھی بھی ساتھ تھے۔ جب بیٹھے بیٹھے تنگ آنے لگے تو گھبراہٹ شروع ہوئی۔ نظموں والے، پنسلوں والے، ہیرسٹوں والے ہماری طرف رخ ہی نہ کرتے تھے۔ آخر ہم میں سے ایک نے جرأت کی اور پوچھ ہی لیا کہ صاحب ہماری باری بھی آنے کی امید ہے یا نہیں۔ اس پر ان لوگوں کو کچھ خیال آیا اور وہ ہمیں ان بکروں کی طرح دیکھنے لگے جو بوچڑ خانے میں اب ذبح ہونے کے قریب ہوں۔ کونے والے "ایم اے پاس" کو ایک کاغذ دیا کہ صاحب اس پر اپنا رول نمبر اور مضمون لکھ کر اپنا نام لکھ دیجئے۔ انہوں نے لکھ دیا۔ کاغذ اگلے صاحب کے پاس آ گیا۔ اور سرکتے سرکتے ہمارے قریب آنے لگا۔ ابھی دو "ایم اے پاس" باقی رہتے تھے کہ واپڈا والوں کے ارباب حل و عقد نے سوچا کہ آخر کانووکیشن میں وہ کیوں نہ حصہ لیں۔ بجلیاں بجھا دیں۔ یا وہ خود ہی بجھ گئیں

مگر آپ کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ہال کیسا تھا یونیورسٹی کا — بس دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ چھت تک نہایت خوبصورت لکڑی کے تختوں کی دیواریں۔ ان تختوں پر کالجوں کے علم اپنے مخصوص نعروں کے ساتھ لہرا رہے تھے تعلیم الاسلام کالج کا مخصوص سیاہ سفید علم ہلال اور ماٹو "علم و عمل" کے ساتھ چمک رہا تھا۔ دیواروں اور چھت کے سنگم پر بجلی کے قمقموں کی ایک قطار چھت کی طرف منہ کئے سحرکاری تھی۔ اور دوسری قطار فرش کی طرف دیکھ رہی تھی اور یہ سب اس طریق پر آویزاں تھے کہ روشنی تھی لیکن چکا چوند نہ تھی۔ دانش گاہ پنجاب کے دانشوروں کا حسن ذوق دیکھ کر ہم پھڑک کر رہ گئے۔ اس قدر وسیع ہال کہ شاید ... ہزار سے بھی زائد نشستوں کا انتظام تھا۔ کرسیاں ایک نئے زاویئے کے ساتھ اور اچھوتے قرینے سے لگائی گئی تھیں۔ نہایت آرام دہ کرسیاں۔ لاؤڈ سپیکر غالباً چھتوں سے لگے ہوئے ہال ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ سٹیج پر کرسیاں سج رہی تھیں وائس چانسلر کی منقش کرسی بہت بھلی معلوم دیتی تھی۔ اتنا وسیع ہال اور یہ سب بغیر ستونوں کے تھا اور دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا

—— بات پہنچی تری جوانی تک

ذکر کچھ تھا بات کچھ شروع ہو گئی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ واپڈا والوں نے بھی کانووکیشن یا کم سے کم ریہرسل میں حصہ لینے کی خاطر بجلیاں گل کر دیں۔ یا وہ خود ہی گل ہو گئی ہوں گی۔ ہمارے دستخطوں کی کمند اس وقت ٹوٹی جب کہ دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا۔ بجلیاں گل ہو جانے پر منتظمین کچھ بوکھلا سے گئے۔ کچھ من چلے "ایم اے پاس" صاحبان سیٹیوں کے شغل میں مصروف ہو گئے

اور دوسرے صاحبان خوش فعلیوں یا خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ ایئرکنڈیشنڈ کولرز اب ہیٹرز بننے شروع ہوئے پہلے کچھ حبس ہوا۔ پھر پسینہ آنا شروع ہوا یہاں تک کہ ناقابلِ برداشت ہوگیا اور ہم ہانپتے کانپتے باہر آگئے اور باہر آکر ٹھنڈا سانس لیا۔ اب ہم شعبہ انتظامیات کے سامنے کھڑے سوچ رہے تھے کہ اللہ جانے اس شعبہ کے ماہرین شاید رہبر سیل کے انتظام میں شریک نہیں کئے گئے۔ ورنہ ضرور کوئی حل نکال ہی لیتے بات صرف اتنی تھی کہ اگر دو گیسوں کا انتظام ہوجاتا تو پھر کام شروع ہو جاتا اور ذرا دیر نہ لگتی۔ مگر شاید یہ کام تو شعبہ انتظامیات کے ماہرین سوچتے اور یہ بات سمجھانے کے لئے ان ماہرین میں سے تو کوئی تھا نہیں اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ سب بیتنظم ہیں۔ آخر خدا خدا کرکے کسی کو یہ سوجھ ہی گئی کہ گیس لاؤ تو کام بن جائے گا۔ غرض گیس آئے اور ہم پھر اندر بلائے گئے اور پانچ منٹ کے اندر ہم نے دستخط کئے اور پسینہ پسینہ ہوکر باہر آگئے۔

اگلے دن یعنی ۲۲ مئی کو کانووکیشن ساڑھے نو بجے شروع ہونی تھی اور یار لوگوں کے ساتھ طے یہ تھا کہ نیلا گنبد پر اکٹھے ہوں گے اور ٹیکسی کا ٹیکس اکٹھے مل کر تقسیم کر لیں گے۔ ہم جو اگلی صبح اٹھے تو دیکھا ابھی کافی وقت ہے مزے مزے سے ناشتہ کیا اور پونے آٹھ کا اندازہ لگایا اور گھر سے چل دیئے۔ اور اپنے اندازے سے ٹھیک پونے آٹھ بجے نیلا گنبد پہنچ گئے لیکن وہاں یار لوگوں کا پتہ تک نہ تھا کسی سے وقت جو پوچھا تو اس نے کہا جناب پونے نو ابھی تو سٹی گم ہو گئی سوچا تو معلوم ہوا ہماری گھڑی پورا ایک گھنٹہ پیچھے تھی۔ فوراً ٹیکسی لی اور پھر پورا ٹیکس ادا کیا اور چند منٹ میں ہال میں پہنچ گئے۔ ہال نصف سے زیادہ بھر چکا تھا۔ لوگ جلد جلد اندر جا رہے تھے۔ ہم بھی اندر پہنچے اور اپنی مقررہ جگہ کی طرف بڑھے تو ایک صاحب نے روک کر کہا "آپ ایم سلے پاس ہیں" ہم نے کہا "جی" انہوں نے ہدایت دی کہ آپ یہاں بیٹھئے۔ ہم نے پوچھا جناب کل کی رہبر سیل کا انتظام کیا ہوا کہنے لگے "درہم برہم" اس لئے جہاں بٹھایا بیٹھ گئے۔ عین ساڑھے نو بجے جناب ابو طالب محمد مصطفےٰ صاحب اور جناب حمید احمد خاں صاحب وائس چانسلر یونیورسٹی کے دوسرے دانشوروں کے ہمراہ جلوس کے ساتھ داخل ہوئے۔ ہم سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ جب سب لوگ بیٹھے تو ہم بھی بیٹھ گئے۔ اجلاس تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوا۔ رجسٹرار صاحب نے جناب وائس چانسلر صاحب سے کارروائی شروع کرنے کی درخواست کی تو وائس چانسلر صاحب نے کھڑے ہوکر کارروائی شروع کرنے سے قبل حاضرین سے درخواست کی کہ وہ پی آئی اے کے عظیم حادثہ میں جن بیش قیمت جانوں کا نقصان ہوا ہے ان کے لئے فاتحہ پڑھ لیں اور دو منٹ کا سکوت اختیار کر لیں اس کے بعد کانووکیشن کا اجلاس باقاعدہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے اعلیٰ ڈگریاں تقسیم ہوئیں یعنی ڈاکٹر آف لٹریچر۔ ڈاکٹر آف فلاسفی وغیرہ اس کے بعد دوسری پیشہ ورانہ سندات یعنی ایم اے جرنلزم۔ ایم ایڈ۔ ایم او ایل وغیرہ۔ آخر میں ایم اے کی باری آئی اور

ہمیں ہماری ڈگری مل گئی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد انعامات کی تقسیم اور تحفے بانٹنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے کہ انعام حاصل کرنے والوں میں ایک کثیر تعداد خواتین کی تھی۔ صنفِ لطیف صنفِ قوی سے کئی میدانوں میں بازی لے گئی۔

احمدی نوجوانوں میں سے صرف ایک تھے جنہیں ہم جانتے تھے۔ جسے انعام ملا تھا۔ دگر نہ چار احمدی لڑکیوں کو اعلیٰ ترین اعزاز ملے۔ دو نے عربی میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ ایک نے جغرافیہ میں اور ایک نے فارسی میں۔ ایک اور امر جسے دیکھ کر طبیعت بڑی خوش ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ اس لٹے پٹے اخلاق کے زمانہ میں بھی ابھی بعض پرانی قدروں کے قدردان باقی ہیں یعنی کئی ایسی خواتین انعام لینے آئیں جو برقعوں میں تھیں شاید انہیں ابھی ترقی یافتہ زمانہ کی ہوا نہیں لگی تھی۔ حالانکہ ایم اے پاس کر چکی تھیں۔

اب جناب مصطفیٰ صاحب کی خدمت میں وائس چانسلر صاحب نے خطاب فرمانے کی درخواست کی ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دیا کہ مصطفیٰ صاحب نے یہ تقریر یونیورسٹی کی درخواست پر نہایت ہی تنگ وقت میں لکھی ہے۔ جب کہ آپ اکرا کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی فرما رہے تھے اور اس کانفرنس کے دوران ہی آپ نے یہ تقریر لکھی۔ اس لئے اگر اس میں کتابت کی یا کوئی اور غلطیاں رہ گئی ہوں تو یہ خطا یونیورسٹی کی سمجھی جائے نہ کہ مصطفیٰ صاحب کی۔

مصطفیٰ صاحب تشریف لائے۔ تقریر شروع کی۔

ہال کا لاؤڈ سپیکر نہایت لاجواب۔ آواز نہایت صاف اتنے بڑے ہال میں گونج کا نام و نشان تک نہ تھا تقریر فن خطابت کا شاہکار تھی۔ فارغ التحصیل نوجوانوں کو ملک و ملت کی خدمت کی اپیل کی گئی۔ اسلام کی اقدار کو از سرِ نو زندہ کرنے کا پیغام دیا گیا اور اپنی عظمتِ رفتہ کو آواز دینے کی درخواست کی گئی۔ ہال بار بار تالیوں سے گونج اٹھتا رہا۔ بڑی باوقار شخصیت بڑی پرشوکت آواز۔ ۱۶ صفحات کی چھپی ہوئی تقریر مصطفیٰ صاحب نے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے شکریہ کے ساتھ ختم فرمائی۔

وائس چانسلر صاحب نے اجلاس ختم کرنے کا اعلان فرمایا۔ حسب دستور مصطفیٰ صاحب پروفیسر حمید احمد خان صاحب وائس چانسلر کے ساتھ جلوس میں ہی باہر تشریف لے گئے۔ اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے ہال سے باہر نکل آئے جہاں گرد و غبار کا طوفان اپنی پوری قوت کے ساتھ شائیں شائیں کر رہا تھا۔

حکایات

(عربی سے ترجمہ!)

(۱) —— کہا جاتا ہے کہ ایک شخص لکڑیوں کا بوجھ اٹھائے جا رہا تھا۔ جب اس کو لکڑیاں بھاری لگیں اور وہ اس بوجھ سے تھک گیا تو اس نے اس کو اپنے کندھے سے نیچے پھینک دیا اور ملک الموت کو پکارا کہ میری روح قبض کر لے۔ دفعتاً ایک شخص اس کے سامنے آیا اور کہا کہ میں ملک الموت ہوں۔ مجھے کس لئے بلایا ہے؟ تب اس آدمی نے کہا کہ میں نے تجھے اس لئے بلایا ہے کہ یہ لکڑیوں کا بوجھ اٹھا کر میرے کندھے پر رکھ دے۔

انسان کتنی چھوٹی سی تکلیف پر موت چاہتا ہے مگر جب موت سامنے نظر آتی ہے تو بڑی سے بڑی تکلیف اٹھاتے ہوئے بھی اسے ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۲) —— حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک حبشی سب کپڑے اتار کر اپنے بدن پر برف ملنے لگا۔ اس اثناء میں اس کے پاس ایک حکیم آیا اور اس سے پوچھا کہ تو یہ کیا کر رہا ہے۔؟ اپنے بدن پر برف کیوں مل رہا ہے۔؟ حبشی بولا اس لئے کہ میں سفید ہو جاؤں۔ حکیم نے کہا تو ناحق اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈال۔ یہ ناممکن ہے البتہ تیرا بدن برف کو سیاہ کر دے گا مگر برف تیرے بدن کی سیاہی کو کم نہ کر سکے گی۔

اگر کسی شخص کی طینت میں ہی بدی ہو تو ہزار تعلیم و تربیت بھی اُسے دور نہیں کر سکے گی۔

(۳) —— کہتے ہیں کہ حضرت لقمان کا گھر نہایت ہی چھوٹا اور خستہ تھا۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ یہ گھر بہت ہی چھوٹا اور لکڑی کے گھر سے بھی نازک ہے۔

آپ نے فرمایا:-

مرنے والے کے لئے تو یہ بھی بہت ہے۔

(۴) — روایت ہے کہ ایک دفعہ حکیم دیوجانس فلسفی کسی ضیافت میں گئے۔ وہاں اُن کے سامنے شراب کا جام پینے کو لایا گیا۔ اس مردِ دانا نے جام لیا اور اسے نیچے دے مارا جس سے وہ ٹوٹ گیا اور شراب ضائع ہو گئی۔ لوگوں نے کہا ہچ! ہچ!! عمدہ شراب ضائع ہو گئی۔ حکیم نے کہا ابھی تو فقط شراب ضائع ہوئی۔ اور اگر میں اس کو پی لیتا تو میرا نفس بھی ضائع ہو جاتا۔

(۵) — ایک دفعہ کسی نے حکیم دیوجانس سے پوچھا کہ کھانا کھانے کے لئے کونسا وقت اچھا ہے۔ تو حکیم نے کہا کہ امیر کو جب بھوک لگے اور غریب کو جب ملے۔

(۶) — ایک خرگوش شیرنی کے قریب سے گزرا تو اس نے کہا کہ میرے ہاں ہر سال بہت سی اولاد ہوتی ہے اور تو ساری عمر میں ایک یا دو بچے جنتی ہے۔ شیرنی نے کہا تو نے سچ کہا کہ میرا بیٹا اگرچہ ایک ہوتا ہے مگر وہ ہوتا تو درندہ ہی ہے نا۔ اور یقیناً ایک لائق بیٹا بہت سی نالائق اولاد سے بہت بہتر ہے۔

(۷) — کہتے ہیں کہ ایک ہرن بیمار تھا۔ اس کے خویش جانور بہت تھے اور وہ تمام کے تمام اس کی عیادت کو آئے، اور جب ان کو بھوک لگی تو وہ اس ہرن کے آس پاس کا تمام چارہ و گھاس کھا گئے۔ اب جب ہرن بیماری سے تندرست ہوا تو اس کو کھانے کو کچھ نہ ملا۔ اور وہ بھوک سے ہلاک ہو گیا۔ جوں جوں کوئی اپنا حلقۂ احباب وسیع کرتا چلا جاتا ہے توں توں اپنی مشکلات میں اضافہ کرتا ہے۔

ساحل و طوفاں

۱۔ کبھی ساحل پہ رہ کر شوق، طوفانوں سے ٹکرائیں کبھی طوفان میں رہ کر فکر ہے ساحل نہیں ملتا

(ریحانہ)

۲۔ آغوش میں ساحل کے کیا لطف و سکوں اس کو یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

(اصغر)

۳۔ کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

(اقبال)

(مرسلہ بی۔ اے نذیر، سال چہارم)

پگڈنڈیاں!

"المنار کے اس مستقل موضوع کے لئے آپ سے گزارش ہے کہ آپ ہمیں ایسے واقعات یا تجربات لکھ کر دیا کریں۔ جن سے آپ کے دلوں پر اصلاحِ معاشرہ کے نقوش ابھرے ہوں۔"

(ادارہ)

پانی میں پانی :-

دودھ میں پانی ملانے کے متعلق تو مدت سے سنتے چلے آ رہے تھے۔۔۔۔۔۔ مگر پچھلے دنوں میں سکھر گیا تو عجیب و غریب قسم کا یہ واقعہ دیکھا۔۔۔۔۔ میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا تھا۔ اس کا مکان شہر کے ایسے حصے میں واقع ہے جہاں پانی کڑوا نکلتا ہے۔ اس لئے ماشکی (سقہ) اس علاقہ کو میٹھا پانی مہیا کرتے ہیں۔ میرے دوست نے ایک دن مجھے صبح صبح جگایا اور کہنے لگا آؤ میں تمہیں ایک نظارہ دکھاؤں۔ میں نے کہا کیا ہے وہ نظارہ؟ چلو میرے ساتھ ۔۔۔۔۔ اس نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر مکان کے قریب ہی درختوں کی اوٹ میں لے گیا۔ ۔۔۔۔۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سقہ صاحبان اپنے مشکیزوں میں بارش کا پانی بھر رہے ہیں۔ ۔۔۔۔۔ میں نے اپنے دوست سے حیران ہو کر پوچھا کہ یہ کیا تماشا ہے۔ اس نے کہا آج تو یہ بارش کا پانی میٹھے پانی میں ملا کر لائیں گے مگر اکثر یہ یہاں کا ہی کڑوا پانی میٹھے پانی میں ملا کر لے آتے ہیں۔ اور ایسے خالص میٹھا پانی بنا کر ہم سے قیمت معینہ لے جاتے ہیں ۔۔۔۔۔ میں یہ سن کر سوچ رہا تھا ۔۔۔۔۔ کہ کاش ہم لوگ اپنا محاسبہ کریں اور دیکھیں کہ ہم کتنے دیانتدار ہیں اور کتنے ۔۔۔۔۔

(عبدالشکور اظہر اوڈھ بوائے)

بڑے لوگ :-

میرا ایک دوست ہے سلیم۔ سادہ سا۔ غریب سا۔ وہ بے چارہ پچھلے دنوں لاہور گیا تو اسے ایک

تکلیف دہ واقعہ سے نبرد آزما ہونا پڑا ——— ہوا یوں کہ وہ ایک دن بھیگے بھیگے موسم میں مال روڈ پر سیر کرنے گیا۔ اتفاق سے اس کے مال روڈ پر پہنچتے ہی بارش تیز ہوگئی۔ اس نے دوڑ کر ایک دکان میں گھسنا چاہا تو دکاندار نے دروازہ بند کرلیا ——— وہ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہونے لگا تو اس کا پاؤں پھسل گیا ——— اس نے ہوائی چپل پہن رکھی تھی وہ بھی ٹوٹ گئی۔ اور اس کی خوبصورت سی پتلون بھی پھٹ گئی ——— وہ بے چارگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ سامنے بند دروازوں کے شٹروں کے پیچھے دکاندار اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ اور سلیم کا چہرہ شرم اور خفت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اچانک ایک کار اس کے پاس آکر رکی ——— ایک آدمی نے سر باہر نکالا اور پوچھا کہاں جائیں گے آپ؟ ——— کرشن نگر اس نے جواب دیا ——— کار اسے گھر کے دروازے تک چھوڑ گئی۔ اس نے متشکرانہ نگاہوں سے کار والے کا شکریہ ادا کیا۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔ ——— ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں ——— بڑے بڑے لوگ ——— عظیم انسان ———

(نسیم احمد سیفی۔ بی ایس سی)

بھائی بھائی :-

پچھلے دنوں ہمارے محلہ میں ایک نئے مکان کی تعمیر شروع ہوئی۔ مالک مکان ایک بہت امیر آدمی ہے ——— ایک دوپہر کا ذکر ہے کہ ایک مزدور بے چارہ سر کے بل دوسری منزل سے نیچے گرا ——— اس وقت معمار اپنے گھر گیا ہوا تھا ——— مالک مکان گرنے والے مزدور کے قریب تھا ——— وہ جلدی جلدی گرنے والے مزدور کے پاس آیا۔ مزدور بے چارہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس نے اسے سائیکل پر بٹھایا اور جلدی سے ڈاکٹر کی دکان پر لے گیا۔ بھائی میرے اس بھائی کے زخموں پر جلد از جلد مرہم لگا دو ——— جتنی چاہو فیس لے لو۔ مگر میرے بھائی کو مزید تکلیف نہ ہونے دو۔ وہ کہنے لگا۔ ——— میں ڈاکٹر کے پاس ہی کھڑا تھا۔ میں نے سوچا یہ شخص (مالک مکان) ہی حقیقی آدمی ہے جو آدمیت کے رشتے کا محافظ ہے ——— اور فطرت کا پرستار ———

(مقبول احمد سیفی سال چہارم)

شبستانِ غزل

- پرویز پروازی
- شیخ روشن دین تنویر
- چوہدری محمد شریف خالد
- حکیم سیّد عبدالہادی
- مبارک احمد عابد
- ہدایت اللہ ہادی
- م۔ا۔ فائق

غزل

آئی سحر تو رات کے سائے ہوا ہوئے
بس اک نظر سے سوختہ جاں کیا سے کیا ہوئے

گریاں ہوئے تو شدّتِ احساس مٹ گئی
چُپ ہو گئے تو پنجۂ دستِ حنا ہوئے

پھرتے ہیں تیری یاد کی خوشبو لئے ہوئے
آوارگانِ شوق بھی بادِ صبا ہوئے

ہم کارواں سے گرد کی صورت بچھڑ گئے
سَیلِ ہوا نما تھے ہوا کی غذا ہوئے

اک عُمر سے تھی درد کی زنجیر پاؤں میں
تیرے اسیر ہو کے ہم گویا رہا ہوئے

شیخ روشن دین تنویر

غزل

چشمِ التفات میں رنگِ پیار کا کہاں
دردخواہ ہو تو ہو، دردآشنا کہاں

عیش کی فضاؤں میں ہمصفیر تھے بہت
رنج کی نواؤں میں کوئی ہمنوا کہاں

راہ میں ہیں دوزخیں، اور بہشت کے بہ کے
دیکھئے اتر پڑے، غم کا قافلہ کہاں

ایک رُخ خزاں سے پُر، ایک رُخ بہار سے
نقشِ زندگی کروں، دِل کا ماجرا کہاں

زد میں آپڑی تو ہے، جانِ ناتواں مری
قوسِ حسن میں مگر تیرِ بے خطا کہاں

مسکراہٹوں سے پُر، ہے فضائے انجمن
میں نے دردِ عشق کا گیت گا دیا کہاں

یاد آرہا ہے تنویر اپنا رنگ پھر
پردہ اب ہوا کہاں، پردہ اب فضا کہاں

چوہدری محمد شریف خالد

صبحِ امید!

بہت مدت کے بعد اب تو زمانے کی ہوا بدلی
چمن بدلا، بہار آئی، سماں بدلا، فضا بدلی

درخشندہ ہوا ہمدم مری آہوں کا سورج بھی
ہوئی صبحِ تمنّا تو شبِ غم نے قبا بدلی

ہوئے تابانیِ انوار سے روشن مکاں سارے
اٹے ہیں یاس کے بادل ہے دنیا جا بجا بدلی

ہوئی رونق ہویدا مرغزاروں سبزہ زاروں سے
عجب انداز اور اطوار سے چالِ صبا بدلی

ہوئے محوِ ترنم پھر سے مرغانِ چمن ہمدم
خوشی میں ڈوبی ہے قمری وہ بلبل نے نوا بدلی

ملے ہیں گوہرِ مقصود متلاشی نگاہوں کو
سبھی کو مل گئی منزل سنو بانگِ درا بدلی

مقدر کی سیاہی مٹ گئی ہے عالمِ دل سے
وہ رنجوروں کی آہ بدلی، غم و رنج کی گھٹا بدلی

اٹھا کر پھینک دے اب تو لباسِ ماتمی تو بھی
نگاہِ ناز نے خالدؔ جفا بدلی، ادا بدلی

حکیم سید عبد الہادی

غزل

○

"وہ نور نہیں ہے شمعوں میں وہ سوز نہیں پروانوں میں"
مفقود یہاں سے دونوں ہوئے، قصّے ہیں فقط افسانوں میں

وہ رنگ نہیں، وہ روپ نہیں وہ نقشہ کہاں ہے عالم میں
حق بات یہی ہے ماضی کا وہ خون نہیں انسانوں میں

جو قوم و وطن کے رہبر تھے، وہ بھی ہیں مقلد غیروں کے
اب آتے نظر ہم مشرب ہیں، وہ رندوں کے میخانوں میں

وہ جامِ عرفاں کے بدلے اب شوق سے وہسکی پیتے ہیں
اب ڈھونڈو جا کر شیخوں کو، پاؤ گے نہیں خم خانوں میں

خاموش چمن ہے دنیا کا، وہ سوز کہاں ہے بلبل میں
جب سے ہے گزر صیادوں کا، ہے رنگ قفس بستانوں میں

آئی جو بہاریں گلشن میں، کچھ شوق سے غنچے کھلنے لگے
یہ دیکھ کے گلچیں نے گلشن، تبدیل کیا ویرانوں میں

جس پیار و محبت سے رہتے ہیں، سارے درندے آپس میں
اس پیار و محبت کو ڈھونڈو، پاؤ گے نہیں انسانوں میں

اے قصرِ طرب کے باشندو اے جامِ ہوش کے متوالو!
تم اجڑے دلوں میں بس جاؤ، راحت ہے نہیں کاشانوں میں

جو رازِ محبت ہے مخفی، انسانوں کی فطرت میں ھادی
کھل جائے تو آنکھوں سے مجھے گردش نہ ہے پیمانوں میں

مبارک احمد عابد

ایک اندھے لڑکے کی صدا

میری قسمت میں ظلمت کو کیوں لکھ دیا
میرے خالق بتا تو نے یہ کیا کیا

جب جہاں میں چمکتا ہے مولیٰ قمر
جس گھڑی سے درخشندہ ہوتی سحر
جس گھڑی کہ منوّر ہو شمسِ فلک
جس گھڑی کہ ستارے دکھائیں جھلک
جس گھڑی رات ڈھلتی ہے ہوتا ہے دِن
اے خدا! دیکھتے ہیں وہ سب تیرے بِن

میرے مالک بتا دے یہ کیا بات ہے
کیا مری زندگی رات ہی رات ہے

میں اکیلا ہوں جانے کدھر جا رہا
اس گھڑی سے مری آنکھ میرا عصا
ناگہاں مجھ کو ٹھوکر لگی گر گیا
سارا عالم "نگاہوں" میں سے پھر گیا
ڈھونڈتا ہوں عصا مجھکو جلدی ملے
نہ مگر وہ ملا ہاتھ دونوں "جھلے"

میرے مولا نہ ہونا تو تجھ سے خفا
جو ہے تیری رضا، وُہ ہے میری رضا
تُو نے آنکھوں کو ہے گرچہ اندھا کیا
یہ بھی میرے لئے تُو نے اچھّا کیا
آنکھوں والے بُرائی میں مشغول ہیں!
جو بُرے ہیں وہی آج مقبول ہیں!
جو کہ ہیں دلربا وہ لڑاتے ہیں آنکھ
جو کہ ہیں بے وفا وہ چراتے ہیں آنکھ
اُن کی آنکھوں پہ شیطاں نے قبضہ کیا
اُن میں پاتا نہیں کوئی نورِ خدا
میں ہوں اندھا مگر پھر بھی مسرور ہوں
کیونکہ نورِ خدا سے میں معمور ہوں
میں نہیں دیکھ سکتا ستارے اگر
نام اپنے کو تارا بناؤں گا میں
جس کو سن کر سمندر دہل جائیں گے
ایسی نوبت جہاں میں بجاؤں گا میں
جس کی کرنوں سے دُنیا اٹھے جگمگا
وہ تصوّر میں سورج بناؤں گا میں
جن کی آواز سے دِل پگھل جائیں گے
گیت پُرسوز عابدؔ وہ گاؤں گا میں

مبارک احمد عابد

غزل

ہم دل کے ہاتھوں اس طرح ناشاد ہوگئے
حسرت کے واقعات کی روداد ہوگئے

ہم لوگ تیرا سایۂ دیوار چھوڑ کر
ایسے گرے کہ سایۂ افتاد ہوگئے

دھوکہ دیا حیات نے کچھ اس طرح ہمیں
آبادیوں کی آس میں برباد ہوگئے

آنکھوں کے وہ اشارے مجھے یاد ہیں ابھی
جو تیرے التفات کی بنیاد ہوگئے

جب التجائے شوق زباں پہ نہ آسکی
ہم خود زبانِ حال سے فریاد ہوگئے

خاموش گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں ہم
جب سے اسیرِ پنجۂ صیاد ہوگئے

جب سے ہمیں اسیری کی نعمت ہوئی نصیب
ہر ایک قید و بند سے آزاد ہوگئے

جن کو کہیں سکون کی دولت نہ مل سکی
تیری گلی میں آن کر آباد ہوگئے

عابد کسی کو یاد کریں بھی تو کیا کریں
ہم آپ ایک بھولی ہوئی یاد ہوگئے

ہدایت اللہ ہادی
بی ۔اے سال دوم

میری تمنّا

آج پھر ہر فردِ ملّت سے ہویدا ہو چلیں !
ہر طرف تاریکیاں ، غمناکیاں
کس طرح ظلمت سے گھبراؤں نہ میں
میں نہ گھبراؤں بھلا !
ایسی ظلمت سے کہ جس میں
آج مذہب کے مقدّس نام پہ
سینکڑوں خوں ہو رہے ہیں ۔
نام بخشا ہے جسے حُبِّ وطن
خون کی پیاسی ہے زمیں
اور سینچا ہے جسے
تم ہی نے اس کو خون سے

دانۂ گندم کے خوشے کو ترستی ہے ، نظرِ دہقان کی
اور کاخِ سلطنت کے سایۂ دیوار میں
آج بھی آباد ہے ، گندم کا فیس
ڈالی ڈالی کو مرا پیغام دو !
توڑ ڈالو ! اب غلامی کی کڑی زنجیر کو
ایک نعرہ ، حرّیت کا ہو بلند !
ایک اعلانِ حیات ،،
احترامِ زیست کی خاطر
اسی میں ڈوب جاؤ !
اور پی لو !
موت کا آبِ حیات !!

یہ تعصّب، بغض، یہ کینہ، عناد
سب کی سب جاں توڑ زنجیریں ہیں۔
اِن کو توڑ دو !
تم سے زنجیرِ مسلسل کا مجھے دعویٰ بھی ہے
مت کرو ! دھرتی کو پابندِ قیود و بندگی
چھوڑ دو لفظی روایت کا جنونِ بے محل
ورنہ تہذیب و ثقافت کے ستوں گر جائیں گے
ہاں مگر ! ملّت کی جاں ہے یہ روایت معنوی
یہ جہانگیری انوّت کی، یہ عزّت کا مقام
اس کو پھر قائم کرو !!

چھا گئی ہے آج عالم پہ سیاہ، تاریک رات
ابنِ آدم جھک گیا ہے،
جرم و عصیاں کے حضور
پیشِ طاغوتِ گناہ
یہ سیاہی اور تاریکی، ہے ناکامی پہ دال
اور ناکامی بھی ہے، جمہور کی
یہ کبھی نے سچ کہا
آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
اب تجھے یہ چاہیئے،
اِک نئی دھرتی، نرالا آسماں پیدا کرے
نور کی بارش ہو، دنیا کو اجالے ڈھانپ لیں
اور مٹ جائے جہاں سے
جرم و عصیاں کا نشاں،

م ۱- فائق

غزل

صلہ یہ ملا مجھ کو دل کی لگی کا
شب و روز رنج و الم دیکھتا ہوں

ہوا ہوں ترے عشق میں ایسا بے خود
خوشی دیکھتا ہوں نہ غم دیکھتا ہوں

بناتی ہے کس کو گراتی ہے کس کو
میں ساقی کی نظرِ کرم دیکھتا ہوں

نہیں جھکتا سر جو کسی کے بھی آگے
ترے آستانے پہ خم دیکھتا ہوں

نگاہوں سے جب سے نگاہیں ملی ہیں
حسینانِ عالم کو کم دیکھتا ہوں

تیری بے نیازی کے قربان جاؤں
"گنہگار ہوں پر کرم دیکھتا ہوں"

اے وطن کے جواں!

میرے وطن کے جواں! اے مرے وطن کے جواں
تری پیشانی پہ روشن ہیں عظمتوں کے نشاں
تو اپنے آہنی کردار کی چٹانوں سے
فریب و ظلم کے دریا بھی پاٹ دیتا ہے
ہاں! اپنے عزم کے تیشوں کا آسرا لے کر
تو راستوں میں ہمالہ بھی کاٹ دیتا ہے
میرے وطن کے جواں! اے مرے وطن کے جواں
ترے ایمان کا مہتاب جب چمکتا ہے
تو گرتے کفر کے بادل ہیں سرنگوں ہو کر

ترے بڑوں کی روایات کے شرارے ہی
تری رگوں میں نمایاں ہیں جوشِ خوں ہو کر

میرے وطن کے جواں! اے مرے وطن کے جواں

جو تیرے دل میں حمیّت کے ولولے جاگیں
تو کوہساروں کے دل اس سے کانپ جاتے ہیں
جہاں میں چاہے مصائب کی آندھیاں آئیں
ترے ارادے حوادث پہ مسکراتے ہیں

میرے وطن کے جواں! اے مرے وطن کے جواں

عدو کی سازشیں ٹکرائیں تیر بن کے مگر
تیری دفاع کا پرچم کبھی نہیں جھکتا
جو چل پڑے کبھی ناموس اور وطن کے لئے
تو تیری جرأتوں کا قافلہ نہیں رکتا

میرے وطن کے جواں! اے مرے وطن کے جواں

تری پیشانی پہ روشن ہیں عظمتوں کے نشاں

(ادارہ)

پاک وطن کے مجاہدو!

اے پاکستان کے جانباز مجاہدو! تم آزادی اور حریّت کے دیوتا، امن کے شہزادے اور عظیم انسانیت پرست ہو۔ ابنِ آدم کی عظمت و رفعت تمہارے ساتھ وابستہ ہے۔ تمہارا خدا ایک، کتاب ایک اور کعبہ ایک ہے تم خالصتہً توحید پرست ہو۔ تمہارے عقیدہ اور ایمان کی سچائی خدا تعالےٰ کے ساتھ لازم و ملزوم کے لازوال رشتہ کی محکم دلیل ہے۔ اے مسلمانو! تمہارے ہاتھوں سے اسلام کی فتح مقدر ہے۔ سو عملِ پیہم، یقین محکم، مسلسل جدوجہد اور کوشش و سعی سے آگے قدم بڑھاتے جاؤ ع۔ پیچھے نہ مڑ کے دیکھ تو آگے قدم بڑھائے جا حقِ خود اختیاریت اور حریّت تمہارا پیدائشی اور فطری حق ہے جس کو دنیا کی کوئی قوم دبا نہیں سکتی۔ بھارتی سامراج کی راجدھانی ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ جو ہمیشہ تشنۂ تعبیر رہے گا۔ تمہارے خون کا ہر قطرہ جامِ شہادت کا منتظر ہے اور ساقیٔ کوثر حضرت محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لئے آبِ حیات لئے بہشت میں منتظر ہیں اور جنّت کی فضائیں تمہارے عظیم تقدّس کی پرستار ہیں۔ تم امن و امان، آزادی و حریّت کے شہنشاہ ہو۔ اے مسلمانو! تم اپنی سابقہ تاریخی روایات کو قائم رکھو تا یہ زمین و آسمان، یہ فضائیں یہ ویرانیاں اور آبادیاں۔ یہ طویل سلسلہ ہائے کوہ غرض کائناتِ عالم کا ذرّہ ذرّہ تمہاری شجاعت اور جوانمردی کا گواہ ہو۔ کہ تم نے مذہب و ملّت آزادی و حریّت کی خاطر ہر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کیا ——— یاد رکھو! ہنود کی بربریت اور ظلم و استبداد کے سائے بڑھنے نہیں دیئے جائیں گے ——— اے محبانِ وطن! تم اپنی آزادی اور حقِ انسانیت کے لئے اپنی تمام زندگیاں اور ہمدردیاں ملک اور قوم کی خاطر وقف کر دو۔ اب آزمائش کا وقت آن پہنچا ہے۔ آج کڑے امتحان کا نوروز ہے۔ بھارتی سامراج نے مسلمانوں کی غیرت کے مقدس جذبے کو چیلنج دیا ہے اور اب وقت کی آہنی زنجیر زندگی اور موت کا فیصلہ چاہتی ہے۔ مسلمانو! آج نہ صرف اعلانِ جنگ

ہے۔ بلکہ احترامِ زیست کی خاطر ایک اعلانِ حیات ہے۔ آگے بڑھو اور پی لو موت کا آبِ حیات!! تم اپنی منزل کی طرف عزم و استقلال اور یقینِ محکم سے آگے بڑھتے جاؤ۔ یہ اسلام اور کفر کی جنگ ہے ہم حق و انصاف کی خاطر جہاد کر رہے ہیں یاد رکھو! وہ دن دور نہیں کہ جب ہماری امیدوں کا جہاز ساحلِ مراد تک پہنچ جائے گا۔ اور ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اقوام کے لئے مثالی وجود بن جائیں گے اور ہر طرف سے آزادی و حریت کی فلک بوس صدائیں بلند ہوں گی۔ اے حریت پسندو! قوموں کی زندگی اور بقاء افراد کی قربانی چاہتی ہے اور یہ انقلاب عظمتِ انسانیت اور رفعتِ آدمیت کی حقیقی روح اور جان ہے جو ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں — سو مجاہدو! تم آگے کی طرف قدم بڑھاتے چلے جاؤ تا حیاتِ جاوید کے مالک بن جاؤ اور فتح و نصرت کا سہرا تمہارے سروں پر اپنی پوری آب و تاب سے چمکے اور تمہاری کشتِ امید بار آور ہو۔ آمین۔

اس کٹھن دور میں ایک اچھے شہری کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود بھی اور دوسروں کو بھی شہریت کے اصولوں پر کاربند کرے تا ملک کے اندرونی حالات میں کسی قسم کا انتشار و تعطل نہ پیدا ہو۔ اور باہمی اتحاد و اخوت تنظیم اور پورے اعتماد سے ہنگامی اور سنگین حالات کا نہایت ہی وثوق سے ذہنی اور فکری توازن قائم رکھتے ہوئے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا جائے نیز ملک نظم و نسق کو منضبط کرنے کے لئے جو بھی قانون جاری کرے اس کا نہایت دل جمعی اور خلوص سے احترام کیا جائے قانون کا احترام نہ صرف ملکی اور قومی فرض ہے بلکہ مذہبی تقدس بھی ہے۔ ایسی ہنگامی صورتِ حال میں کسی قسم کی کوئی من گھڑت قیاسی یا ظنی افواہیں نہ پھیلائیں۔ اس سے ملکی اور قومی سالمیت کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے ہر شہری کا فرض ہے کہ پورے عزم و استقلال سے صورتِ حالات کا مقابلہ کرتا چلا جائے۔ آپ یقین سمجھ لیجئے کہ خدا آپ کے ساتھ ہے اور انشاء اللہ فتح حق کی ہو کر رہے گی۔ ایسے ہی مجاہدینِ کشمیر کی فتح و نصرت کے لئے دردِ دل سے دعائیں کریں۔ نیز ان کی عملی مدد بھی کیجئے اور مجاہد فنڈ میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے کر جہاد میں شریک ہوں تا کہ ان کی اور ان کے لواحقین کی بہتر صورت میں بر وقت مدد کی جائے۔ یہ آزمائش اور امتحان کا وقت ہے اور وطنیت کا مقدس جذبہ بھی اس عملی خدمت کا متقاضی ہے

اے مسلمانو! تم اپنے عظیم خدا اور خواجۂ دو جہان صلے اللہ علیہ وسلم کی خاطر اتحاد و یگانگت اور یکجہتی سے کفر کا مقابلہ کرو۔ یاد رکھو! ایسے نادر مواقع قوموں کی زندگی میں بار بار نہیں آتے سو ابھی وقت ہے اس کی قدر کیجئے اس کی عظمت و رفعت اور بلندی کو پہچانیئے۔ ؎

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ
دم دے نہ جائے ہستیِ ناپائدار دیکھ

AL-MANAR

JUL., AUG., SEP.,

1965

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE